کنارِ نیل

کے اشرف

جملہ حقوق بحق خواجہ اشرف محفوظ ہیں

ISBN: 978-1-4675-2398-1

کتاب: بر کنارِ نیل

مصنف: کے اشرف

پروف ریڈنگ:راشد اشرف

سرورق: چارلس کینٹز

سال اشاعت: 2012

تعداد اشاعت: 1000

مطبع: سی ڈبلیو پرنٹرز

قیمت: دس ڈالرز– 250روپے

سی ڈبلیو پرنٹرز،1375یونیورسٹی ایونیو،برکلے،یوایس اے

انتساب

جہاں گردوں کے نام

اظہارِ تشکر

میں اُن تمام دوستوں اور قارئین کا شکر گزار ہوں جو میری تحریریں پڑھ کر گاہے بگاہے اپنی آراء کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی آراء جان کر مجھے جہاں اپنی لکھی تحریروں کی فنی خوبیوں اور خرابیوں کا پتہ چلتا ہے وہیں مزید لکھنے کی تحریک بھی ملتی ہے۔

"کنار نیل" کے حوالے سے میں خاص طور پر کراچی میں مقیم اپنے مہربان دوست راشد اشرف صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے انتہائی دقت نظر سے اس کی پروف ریڈنگ کی اور اس میں اغلاط کی اصلاح فرمائی۔

پیش لفظ

ابھی "اسرائیل میں چند روز" کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ شوقِ آبلہ پائی پھر سفر پر اُکسانے لگا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی پسندیدہ سرزمینوں کی فہرست کا از سر نو جائزہ لیا۔ اس بار کرہء فال مصر کے نام نکلا۔ مصر کا خیال آتے ہی میں نے مصر کے سفر کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ مصر بہت بڑا ملک ہے۔ اتنا بڑا کہ اگر کلومیٹرز میں اس کے حدود اربع کا احاطہ کیا جائے تو اس کا رقبہ دس لاکھ کلومیٹرز کے قریب بنتا ہے۔ یہ چار خطوں پر مشتمل ہے۔ ایک علاقہ وادیء نیل کہلاتا ہے۔ دوسرا مغربی صحرا۔ تیسرا مشرقی صحرا اور چوتھا وادی سینا۔ مصر کے ۹۹ فیصد لوگ وادیء نیل میں رہتے ہیں۔ ایک فیصد ملک کے باقی حصے میں رہائش پذیر ہیں۔ صرف یہ نہیں کہ مصر جغرافیائی طور پر ایک بڑا ملک ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی مصر کثیر التعداد تہذیبوں کا مرکز رہا ہے کہ چند روز کے اس سفر نامے میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

قاہرہ مصر کا سب سے بڑا شہر اور ملک کا دارالسلطنت ہے۔ میں عام طور پر دارالخلافوں کی سیاحت کا قائل نہیں۔ میرے نزدیک کسی بھی ملک کے دارالخلافے اس ملک کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے۔ حکمران طبقات کو اپنی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے دارالخلافہ کے دیگر مکینوں کو بھی کچھ نہ کچھ مراعات دینا پڑتی ہیں جس سے دارالخلافے ملک کے باقی شہروں کی صحیح ثقافتی، معاشی اور سماجی زندگی کی عکاسی نہیں کرتے۔ لیکن مصر کے دارالخلافہ قاہرہ کی کہانی باقی دارالخلافوں سے قدرے مختلف ہے۔

قاہرہ مصر ہے اور مصر ایک بہت بڑا ملک ہونے کے باوجود قاہرہ ہے۔ تاریخ کے صفحات پر منقش یہ شہر اپنے در و دیوار پر اتنی کہانیاں سجائے ہوئے ہے کہ قاہرہ کی تاریخ انسانی تاریخ

معلوم ہوتی ہے۔ فراعنہ مصر سے لیکر جدید دور تک شاید ہی کوئی تہذیب ہو گی جس سے مصر کا پالانہ پڑاہو۔اس کااندازہ مصر میں آبادلوگوں کی گروہی شناخت سے باآسانی کیاجاسکتاہے۔

مصر میں اگر آپ کو ایک طرف خالص مصری لوگ دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف آپ کو بدو، آرمینی، یونانی اور کرد باشندے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب مصر کے شہری ہیں اور اپنے اپنے انداز میں مصر کے ثقافتی تارپود کا حصہ بھی ہیں۔

جغرافیائی اعتبار سے اگر مصر براعظم افریقااور براعظم ایشیاکے سنگم پر واقع ہے تو تاریخی اعتبار سے مصر اپنی چھ ہزار سالہ تاریخ میں ایرانیوں، رومنوں،یونانیوں، عربوں،فاطمیوں، مملوکوں ، عثمانیوں ، فرانسیسیوں اور انگریزوں کی یلغار کا شکار ہوا۔ ہر حملہ آور نے مصر کی ثقافت، تہذیب، طرزِزندگی اور زبان پر اثرات مرتب کئے۔

تاہم اِن حملہ آوروں میں سے مصر پر سب سے زیادہ دوررس اثرات عربوں نے ڈالے۔ جن کی وجہ سے زیادہ تر مصری نہ صرف حلقہ بگوش اسلام ہوئے بلکہ اُن کا رہن سہن، طرزِزندگی اور سوچ کا انداز ہمیشہ کے لئے بدل گیا۔ مصر جغرافیائی طور پر افریقہ کا حصہ ہونے کے باوجود بڑی حد تک ثقافتی اور روحانی طور پر مشرقِ وسطیٰ کا حصہ بن گیا۔

مصر کی یہی تاریخی اور ثقافتی رنگارنگی ہمیشہ مجھے اپنی طرف دعوتِ سفر دیتی رہی۔ خاص طور پر خطے کے ایک اور اہم ملک اسرائیل کے سفر کے بعد مصر کا سفر مجھے ایک ذمہ داری بھی محسوس ہوا جسے پورا کرنا ضروری تھا۔

اسرائیل کے سفر کے دوران میری زیادہ تر توجہ اسرائیلی پیغمبروں کے مزارات کی سیاحت پر مرکوز رہی۔ لیکن اسرائیل کے سفر کے برعکس مصر کا سفر اِس ملک کی عظیم الشان تاریخ کے

مظاہر کا مطالعہ اور مشاہدہ ہے۔ چناچہ اِس سفر کے دوران آپ میرے ساتھ زیادہ تر تاریخی مقامات کی سیاحت کریں گے۔ تاریخی مقامات بھی وہ جو قاہرہ کے ارد گرد پھیلے ہیں۔

اس سفر میں ہم لکسر، سکندریہ اور اسوان بند نہیں جائیں گے۔ ان اہم شہروں کی سیاحت کے لئے مجھے بشرط زندگی ایک بار پھر مصر کا سفر کرنا پڑے گا۔ فی الحال دوبارہ مصر جانے کا ارادہ تو مصمم ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی اور دوبارہ مصر گیا تو ان کا احوال مصر کے اگلے سفر نامے میں آپ کے ذوقِ طبع کے لئے پیش کروں گا۔

فی الحال اِس مختصر سفر نامے کے بارے میں آپ رائے ضرور لکھیں۔ مجھے انتظار رہے گا۔

کے اشرف
1375 یونیورسٹی ایونیو، برکلے، کیلیفورنیا، 94702
یو ایس اے
Email: kashraf@ix.netcom.com

EGYPT
MEDITERRANEAN SEA
ISRAEL & THE PALESTINIAN TERRITORIES
Marsa Matruh
Alexandria
Port Said
LIBYA
JORDAN
Sidi Abdel Rahman
Giza
Cairo
Suez
Medinat al-Fayoum
Al-Fayoum Oasis
Siwa
Beni Suef
Dahab
SAUDI ARABIA
Bawiti
Minya
Qasr al-Farafra
Mallawi
Nile River
Hurghada (Al-Ghardaka)
Sohag
0 150 km
0 90 miles
Dakhla Oasis
Mut
Kharga
Luxor
RED SEA
Marsa Alam
Aswan
Berenice
Tropic of Cancer
Lake Nasser
Administrative Boundary
SUDAN
Political Boundary

مصر کا نقشہ

نیویارک سے قاہرہ تک

چار مارچ کی صبح یونائیٹڈ ایئر لائنز کی مارننگ فلائٹ سے مصر جانے کے لئے سان فرانسسکو سے نیویارک پہنچا تو سارے سسٹم دکھا رہے تھے کہ قاہرہ کے لئے ایجپٹ ایئر لائن کی فلائٹ وقت پر روانہ ہوگی۔ آج کل جب کہ یو ایس ایویشن نے ایئر لائنز سے وقت کی پابندی کرنے کے سخت قوانین نرم کر دیئے ہیں ایئر لائینوں کی پروازوں کی شیڈول پر روانگی میں دن بدن کمی واقع ہو رہی ہے۔ مسافر ایئر پورٹس پر لاوارثوں کی طرح پڑے اپنی پروازوں کی روانگی کے صحیح وقت سے بے خبر اونگھتے رہتے ہیں۔

میں دن کے پچھلے پہر سان فرانسسکو سے جے ایف کے ایئر پورٹ پر پہنچا تو موسم خوشگوار ہونے کے باوجود اپنی پروازوں کے منتظر بہت سے مسافروں کو گومگو کی حالت میں دیکھ کر قاہرہ کے لئے اپنی پرواز کے بارے میں بھی میرے ذہن میں خدشات پیدا ہوئے۔ خاص طور پر جب کہ بین الاقوامی مسافروں میں ایجپٹ ایئر لائن کی شہرت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ لیکن میرے خدشات اُس وقت تعجب میں بدل گئے جب ایئر لائن نے قاہرہ روانگی کے لئے بروقت بورڈنگ شروع کر دی۔

اسمارٹ ہوائی مسافر جانتے ہیں کہ بروقت بورڈنگ کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جہاز وقت پر روانہ ہوگا۔ عین وقت پر ایئر لائنوں والے جہاز کی تاخیر کے سو بہانے تراش لیتے ہیں۔ اور پھر جہاز کئی کئی گھنٹے ایئر پورٹ پر ہی رُکے رہتے ہیں۔

لیکن اُس روز خلافِ معمول ایجپٹ ایئر لائن نے کوئی ایسی حرکت نہ کر کے مسافروں پر خوش گوار تاثر قائم کیا۔ فلائٹ کے عملے ،نوجوان خواتین ایئر میزبانوں اور قدرے معمر مرد

میزبانوں نے پوری تندہی سے مسافروں کو خوش آمدید کہہ کر اور اُنہیں سیٹوں پر بیٹھنے میں مدد دے کر اِس اچھے تاثر کو مزید مستحکم کیا۔ ایک معمر آدمی جو پچاس کے پیٹے میں ہوگا چاکلیٹی کوٹ پہنے خندہ پیشانی سے ہر مسافر سے پوچھ رہا تھا کہ آیا وہ اپنی جگہ پر آرام محسوس کر رہے ہیں۔ اُنہیں اپنے سفر کو آرام دہ بنانے کے لئے کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں۔

میرے ساتھ والی دو سیٹوں پر ایک نوجوان مصری جوڑا بیٹھا تھا۔ میاں اور بیوی دونوں پچیس چھبیس سال کے دکھائی پڑتے تھے۔ خاتون نے ماہ دو ماہ کا ایک نوزائدہ بچہ گود میں اُٹھا رکھا تھا۔ بچہ جہاز کے ماحول کی نامانوسیت کی وجہ سے اُوں آں کر کے رو رہا تھا۔ میاں بیوی کے بچے کو چپ کرانے کے طریقے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بے چارے نئے نئے ماں باپ بننے کی وجہ سے بچے کو پچکارنے اور بہلانے کے ہنر سے ابھی ناواقف ہیں۔

ایک نوجوان خاتون ائیر میزبان نے بچے کو اُوں آں کرتے سنا تو اُس نے آگے بڑھ کر ماں سے اُس کا بیٹا لے لیا۔ بچہ خاتون ائیر میزبان کے پاس جاتے ہی فوراً چپ ہو گیا۔

تب تک وہی معمر دکھائی دینے والے صاحب جن کے چاکلیٹی کوٹ کے کالر پر کوئی ایسا بیج نہیں تھا جس سے ائیر لائین سے اُن کے تعلق یا اُن کے عہدے کی شناخت ہو سکتی وہاں چلے آئے۔ وہ آتے ہی مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھنے لگے کہ مجھے بچے کی وجہ سے کوئی پریشانی تو نہیں۔ پھر کہنے لگے اگر مجھے بچے کی موجودگی سے زحمت ہو رہی ہو تو وہ میری سیٹ تبدیل کر سکتے ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ مجھے بچوں کی اُوں آں اچھی لگتی ہے اور میں اُس سے بالکل پریشان نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے میرے جواب پر اطمینان کا سانس لیا۔

میں نے مزید بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ بچوں کی اُوں آں میں مجھے زندگی اپنی بقا کا اعلان کرتی سنائی دیتی ہے۔

وہ صاحب میرا جواب سن کر مسکرائے اور پھر فرمانے لگے کہ ہماری ائیر میزبانیں چھوٹے بچوں کو لُبھانے کا ہنر جانتی ہیں۔ بچہ اگرچہ ابھی چند ماہ کا ہے لیکن وہ اُس کے آرام کا بندوبست کر دیں گی تو وہ سارے سفر کے دوران مست پڑا رہے گا۔

اِنہی باتوں میں ایجپٹ ائیر لائن کا جہاز عین وقت پر ٹیکسی ہو کر فضا میں پرواز کر گیا۔ جیسے ہی فلائٹ قدرے ہموار ہوئی اُسی ائیر میزبان نے ایک پالنا نما ٹوکری بچے کے ماں باپ کی سیٹ کے سامنے جہاز کے پینل کے ساتھ اٹیچ کر دی۔ پھر اُس نے اُس پالنا نما ٹوکری میں کمبل رکھ کر اُسے آرام دہ بنایا اور بچے کو اُس میں لٹا دیا۔ گرم اور آرام دہ کمبل میں لیٹتے ہی تھوڑی دیر میں بچہ سو گیا تو اُس کے نوجوان ماں باپ نے سکھ کا سانس لیا۔

اِس کے تھوڑی دیر بعد پائلٹ نے چند ضروری ہدایات کا اعلان کیا۔ اپنی ہدایات میں اُس نے چند بار لفظ خروج استعمال کیا۔ خروج کے ج کا تلفظ اُس نے گ کیا۔ آج سے پہلے میں نے مصریوں کو کئی بار جمال عبدالناصر کو گمال عبدالناصر کہتے سنا تھا لیکن خروج کا تلفظ پہلی بار پائلٹ کے منہ سے خروگ سن کر تعجب ہوا۔ مصریوں کے لئے ج لفظ سے پہلے آئے یا آخر میں وہ اُس کا تلفظ گ ہی سے کرتے ہیں۔ حالانکہ گ کا حرف عربی حروفِ ابجد کا حصہ نہیں ہے۔ شاید جیم کا گاف تلفظ کر کے مصری اپنے غیر عرب ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔

جیم کا گاف تلفظ سن کر میں سوچنے لگا کہ جن الفاظ میں ج درمیان میں پڑتا ہے اُسے مصری کیسے ادا کرتے ہوں گے۔

پائلٹ کے اعلانات کے بعد رات کے کھانے کا دور شروع ہوا۔ پہلے کئی طرح کی یخ ڈشیں پیش کی گئیں جن کا جزوِ اعظم سمندری مخلوقات اور سبزیات و میوہ جات تھے۔ اُس کے بعد گرم ڈشوں کا سلسلہ شروع ہوا جن میں گائے، بکرے اور مرغ کے گوشت کی ڈشیں شامل تھیں۔

ایک ڈش چاولوں، بھنڈیوں اور مرغ کے کوفتوں کو ملا کر بنائی گئی تھی جو کبھی کہیں اور کھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

بہر حال کھانے پینے کا دور ختم ہوا تو زیادہ تر لوگوں نے باقی وقت سو کر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ قاہرہ اور نیویارک کے وقت میں نو گھنٹے کا فرق تھا۔ اور کمپیوٹر کی اسکرین کے مطابق قاہرہ میں پہلے ہی سحری کا وقت ہو رہا تھا۔ شاید جہاز پر سوار مسافر قاہرہ پہنچنے سے پہلے کچھ نیند پوری کرنا چاہتے تھے۔

باقی مسافروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنی سیٹ دراز کی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ لیکن نیند حسبِ معمول آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جہاز میں کئی مسافر کیسے اِتنی گہری نیند سو لیتے ہیں اِس کا مجھے آج تک ادراک نہیں ہو سکا۔ کئی مسافر تو اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ باقاعدہ اُن کے خراٹے سنائی دینے لگتے ہیں۔

جہاز کو نیویارک سے اُڑے تقریباً تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ کمپیوٹر اسکرین کے مطابق جہاز ابھی یورپ کے ساحلوں سے دور بحر اوقیانوس کے پانیوں پر ۳۷ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ تاحال فلائٹ مکمل ہموار تھی۔ لیکن یہ صورتِ حال اُس وقت تبدیل ہو گئی جب اچانک ہوا کا دباؤ کم ہونے سے جہاز کو جھٹکے لگنے لگے۔ جہاز عین بحر اوقیانوس کے پانیوں کے اوپر اُسی طرح کانپ رہا تھا جیسے زلزلے کے وقت زمین کانپتی ہے۔

ہوائی سفر کا خاصہ تجربہ ہونے کی وجہ سے مجھے یہ جھٹکے ہوا کے دباؤ میں کمی پیدا ہونے والے معمول کے تلاطم دکھائی دیئے لیکن اُس وقت میں بھی گھبرا گیا جب سبھی سونے والے ہڑبڑا کر اُٹھ گئے کیونکہ کچھ اُوور ہیڈ بن کھلنے کی وجہ سے ہلکا سامان اُن کے سروں پر گرنے لگا تھا۔

ٹربولینس کی وجہ سے جہاز جس بُری طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا زیادہ تر مسافروں کا خیال تھا کہ وقتِ آخر آپہنچا ہے۔ ایک مصری خاتون تو باقاعدہ بے ہوش ہوگئی۔ تجربہ کار ائیر میزبانیں اُسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

جہاز کی ٹربولینس تھی کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھے ایک ہسپانوی نوجوان نے جو قاہرہ میں رہتا تھا اور چھٹی گزارنے امریکہ آیا تھا کہا کہ ہمیں لائف جیکٹ پہن لینی چاہئے۔ اُس کی تجویز سن کر میں نے ازراہِ مذاق کہا کہ میں نے آج تک نہیں سُنا کہ لائف جیکٹ نے کبھی کسی جہاز کے تباہ ہونے کے بعد کسی مسافر کی زندگی بچائی ہو۔ اِس لئے آج یہ لائف جیکٹ شاید ہمارے کام بھی نہیں آئے گی۔

وہ ہسپانوی نوجوان میری بات سُن کر تھوڑا سا زبردستی کی ہنسی ہنسا لیکن پھر ٹربولینس کی شدت کی وجہ سے فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا۔

صورتِ حال اُس وقت اور بھی بگڑ گئی جب کمپیوٹر کی اسکرین پر منزل اچانک قاہرہ سے شینن میں بدل گئی۔ پائلٹ نے بتایا کہ اُس نے فنی خرابی کی وجہ سے جہاز کا رخ قریب ترین ائیر پورٹ کی طرف موڑ دیا ہے جو کہ آئرلینڈ کا شہر شینن ہے۔ لیکن اُس نے مسافروں کو پینک ہونے سے بچانے کے لئے تکنیکی خرابی کی کسی نوعیت سے آگاہ کرنے سے گریز کیا۔

اُس کے اعلان کے بعد واضح طور پر محسوس ہوا کہ جہاز اُڑنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ اِس دوران کمپیوٹر کی اسکرین پر شینن کا فاصلہ کبھی ساڑھے چار سو میل دکھائی دیتا کبھی ایک سو نوے میل اور کبھی ایک سو چالیس میل۔ جہاز کے سب مسافر بار بار ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آیا جہاز پانی پر اُڑ رہا ہے یا خشکی پر۔

میری پچھلی سیٹ پر بیٹھے صاحب ایک دوسرے صاحب کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ وہ بہت اچھا تیراک ہے۔

پائلٹ بار بار مسافروں سے سیٹ بیلٹ باندھے رکھنے اور اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہنے کی اپیل کر رہا تھا۔

اِس دوران میں نے اپنی گزری زندگی پر چند منٹ نظریں دوڑائیں۔ مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اگر ان حالات میں موت واقع بھی ہو جاتی ہے تو یہ کوئی اتنا بڑا المیہ نہیں ہو گا۔ میں نے اپنا پاسپورٹ اور دیگر شناختی دستاویزات پینٹ کی بیک پاکٹ میں ڈال کر بٹن بند کر دیا اور پھر مستقل طور پر فطرت کا حصہ بننے کے لئے ایک طمانیت سے آنکھیں بند کر لیں۔

جہاز ابھی تک پرواز کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اُس کی اسپیڈ کم سے کم ہوتی جا رہی تھی اور اُٹھان میں مسلسل کمی آ رہی تھی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد جہاز نے شینن کے ایئر پورٹ پر لینڈ کیا تو امدادی محکموں کی گاڑیاں جہاز کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ جہاز کی اسپیڈ کم ہوئی اور پھر جہاز گیٹ کے قریب جا کر رُک گیا۔ جہاز کا دروازہ کھولا گیا تو امدادی ٹیم کے لوگ فوراً جہاز کے اندر آ گئے۔ وہ سیدھے کاک پٹ میں پائلٹ کے پاس پہنچ گئے۔ تب مسافروں کو پائلٹ کی امدادی ٹیم کے ارکان سے گفتگو سے پتہ چلا کہ ٹربولینس کے دوران جہاز کا ایک انجن فیل ہو گیا تھا۔ اور جہاز گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے ایک انجن کے ساتھ پرواز کر رہا تھا۔

میں نے ماضی میں کئی بار آئرلینڈ جانے کا ارادہ باندھا لیکن کبھی بوجوہ اپنے ارادے کو عملی صورت نہ دے پایا۔ ہمیشہ آئیر لینڈ کے کسی قریبی ملک کی سیاحت کے بعد واپس اپنے دیس امریکہ لوٹ جاتا۔

لیکن آج قدرت جن حالات میں آئر لینڈ لائی تھی آئیر لینڈ آنے کی خوشی کم اور جان بچی سو لاکھوں پائے کی کیفیت زیادہ تھی۔

امدادی ٹیموں کی رُخصتی کے بعد پائلٹ نے اعلان کیا کہ سب مسافر اپنا اپنا سامان لے کر شینن کے مسافر لاونج میں چلے جائیں اور وہاں اپنے باقی ماندہ سفر کے بارے میں ائیر لائن کے اگلے پروگرام کے اعلان کا انتظار کریں۔

جہاز کے سبھی مسافر اپنا سامان اُٹھا کر مسافر لاؤنج میں پہنچ گئے۔ شینن ائیر پورٹ کے مسافر لاؤنج میں فری انٹر نیٹ سروس موجود تھی۔ میں نے اِس فری سروس کو غنیمت جانتے ہوئے اپنا کمپیوٹر آن کیا اور گزشتہ دن کی ای میلز چیک کیں۔ دوستوں کو ای میل کے ذریعے اپنے موجودہ حدود اربعہ اور جہاز کی ایمر جنسی لینڈنگ اور شینن میں وقتی قیام کی اطلاع دی۔ ایسے حالات میں یو ایس اے میں اپنے اہلِ خانہ اور چند ایک دوستوں سے انٹر نیٹ فون پر بات کرنا اچھا لگا۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہی چاکلیٹی کوٹ والے صاحب مسافر لاونج میں وارد ہوئے اور اعلان کیا کہ سب مسافروں کو ٹرانزٹ ویزا دیا جائے گا۔ سب مسافر بسوں میں سوار ہو کر ہوٹل جائیں گے۔ وہاں سب مسافروں کو پہلے ناشتہ دیا جائے گا۔ پھر آرام کرنے کے لئے سب کو کمرہ دیا جائے گا۔ اُس کے بعد لنچ ہو گا۔ اُس کے بعد بتایا جائے گا کہ قاہرہ کے لئے نئی فلائٹ کی روانگی کس وقت ہو گی۔

مسافروں میں زیادہ تر مصری مرد اور عورتیں تھیں جو اپنے عزیز و اقارب سے ملنے مصر جا رہے تھے۔ چند ایک امریکی عورتیں اور مرد بھی تھے جو میری طرح مصر کی سیر کے لئے جا رہے

تھے۔ جہاز میں میرے ساتھ بیٹھے ہسپانوی نوجوان نے مسافر لاؤنج میں ایک ساتھی مسافر لڑکی سے دوستی کرلی تھی۔ جس کے ساتھ مسلسل اُس کی گپ شپ چل رہی تھی۔

اُس خاتون نے مجھے کمپیوٹر استعمال کرتے دیکھا تو مختصر وقت کے لئے میر الیپ ٹاپ مستعار لے کر اپنی ای میلز چیک کیں۔ اُس نے ای میلز چیک کر کے لیپ ٹاپ مجھے لوٹایا تو میں نے انٹرنیٹ بند کر کے لیپ ٹاپ واپس بیگ میں ڈالا اور پھر اُس ہسپانوی نوجوان اور خاتون کے ساتھ گپ شپ میں شامل ہو گیا۔ جلد ہی ہم تینوں کی کیمسٹری مل گئی۔ بوریت کے ان لمحوں میں باہمی گپ شپ نے ہمارے لئے ٹانک کا کام کیا۔ چناچہ تھکاوٹ کے باوجود ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ٹرانزٹ ویزا لے کر ہوٹل جانے کی بجائے چند گھنٹوں کے لئے شینن کی پیدل سیاحت کریں گے۔ وہیں کہیں رُک کر لنچ کریں گے اور پھر واپس ایئر پورٹ آجائیں گے۔

میں نے احتیاطاًلاؤنج میں کھڑے چاکلیٹی کوٹ والے ایئر لائن کے اہل کار سے پوچھا کہ اُس کے اندازے کے مطابق ہم کب شینن سے روانہ ہو سکیں گے۔ اُس نے ہاتھ کی انگلیوں پر گھنٹے گنتے ہوئے مجھے بتایا کہ قاہرہ سے خالی جہاز روانہ ہو رہا ہے۔ جیسے ہی وہ جہاز وہاں سے روانہ ہو گا ہم صحیح وقت کا تخمینہ دے سکیں گے۔ تاہم فی الحال محتاط اندازے کے مطابق اتنا کہا جا سکتا ہے کہ نئے جہاز کے آنے اور مسافروں کو لے جانے میں تقریباً دس گھنٹے لگ جائیں۔ جس کا مطلب تھا کہ ہم شینن سے قاہرہ کے لئے دوسرے جہاز میں لوکل وقت کے مطابق شام سات آٹھ بجے کے قریب روانہ ہوں گے۔

ہم تینوں کے پاس شینن میں گھومنے پھرنے کے لئے پانچ چھ گھنٹے کا وقت تھا۔ ہمارے ارادے بھانپتے ہوئے ایئر لائن کے اُسی معمر اہل کار نے اعلان کیا کہ سب مسافروں کو ہر صورت میں بس میں بیٹھ کر ہوٹل جانا ہو گا۔

ہم تینوں نے اُس کے اعلان کے بعد فیصلہ کیا کہ ہم باقی مسافروں کے ساتھ پہلے بس میں ہوٹل جائیں گے اور پھر وہاں سے چپکے سے شہر کی سیر کو نکل جائیں گے۔

ایسا لگتا تھا ہم تینوں میں ایک وقتی رشتہ قائم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے ہیں۔ لیکن مزے دار بات یہ تھی کہ ہم تینوں میں سے ابھی تک کسی نے کسی کا نام نہیں پوچھا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ مختلف موضوعات پر ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے سالہا سال سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں اور طویل جدائی کے بعد دوبارہ ایک دوسرے اچانک کہیں مل بیٹھے ہوں۔

اِس سے پہلے کہ ہم شیشن میں امیگریشن سے گزر کر بسوں میں سوار ہو کر ائیر پورٹ سے باہر جاتے مسافر لاؤنج میں دو سو کے قریب خاکستری وردیوں میں ملبوس امریکی فوجی، مرد اور عورتیں، گھسے چلے آئے۔ اُن کے لاؤنج میں آتے ہی ہمارے پاس کھڑے ایک مصری نوجوان نے دو فوجیوں سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جارہے ہیں۔

فوجیوں نے اسپاٹ چہروں کے ساتھ پہلے اُسے گھورا اور پھر اسپاٹ آواز میں بتایا کہ وہ امریکہ سے آئے ہیں اور افغانستان جارہے ہیں۔

مصری نوجوان نے اُن فوجیوں کے ساتھ بحث شروع کر دی کہ وہ افغانستان کیوں جارہے ہے۔ اُنہیں افغانستان جانے سے انکار کر دینا چاہئے۔ وہ اُسی طرح جذبات سے عاری اسپاٹ لہجے میں اُس سے کہہ رہے تھے کہ کوئی فوجی اپنی ہائی کمان کے آرڈر سے انکار نہیں کر سکتا۔ اُسے ہائی کمان کی طرف سے جو بھی آرڈر ملے اُسے ہر حال میں پورا کرنا پڑتا ہے۔

میں نے مصری نوجوان کو اُن فوجیوں سے بحث میں اُلجھتے دیکھا تو سمجھانے کے انداز میں اُسے روکا کہ فوجیوں کے ساتھ اِس موضوع پر بحث اُس کے لئے خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔

مصری نوجوان دماغ کا خاصہ موٹا تھا اس لئے میری بات سمجھنے سے قاصر رہا۔ میں نے بھی اُس کی بات میں اس سے زیادہ مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر اُس نے عربی میں مجھے مخاطب کر کے کہا اللہ کرے اِن میں سے کوئی افغانستان سے زندہ واپس نہ آئے۔ میں نے اپنے سر کے قریب اُنگلی گھما کر اُسے کہا کہ وہ پاگل ہے جو ایسی بات کر رہا ہے۔ پاس ہی بنچ پر بیٹھی دو مصری خواتین نے گھور کر مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ لیکن میرے سمجھانے کا یہ اثر ہوا کہ وہ مصری نوجوان امریکی فوجیوں سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اچانک اُس کی نظر میرے کوٹ کے کالر پر پاکستانی اور امریکی جھنڈوں کے مشترکہ بیج پر پڑی تو طنزیہ انداز میں عربی میں کہنے لگا میں سمجھا تھا کہ تم مصری ہو لیکن تم تو پاکستانی ہو۔

میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں جواب دیا کہ میں پاکستانی امریکن ہوں۔ فوجیوں نے مجھے پوچھا کہ وہ عربی میں کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا میں زیادہ عربی نہیں جانتا۔ اس لئے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن وہ ضرور پاگل ہے۔ میری بات پر دونوں نوجوان فوجی ہنسنے لگے۔ اُن میں سے ایک نے ہنستے ہوئے کہا شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔

اِس دوران ہمارے ساتھی مسافر امیگریشن لاؤنج کی طرف چل پڑے۔ اُن کے دیکھا دیکھی میں ہسپانوی نوجوان اور امریکی لڑکی، ہم تینوں بھی ایک ساتھ چلتے امیگریشن لائن میں جا کھڑے ہوئے۔

اتوار کی چھٹی کی وجہ سے امیگریشن کاؤنٹر پر صرف ایک عورت اور ایک مرد دو کاؤنٹروں پر کام کر رہے تھے۔ میری باری آئی تو میں نے امیگریشن افسر سے کہا کہ وہ صرف دو ہیں اور لائن میں پانچ سو لوگ ہیں۔ اُن کو اُنہیں کلیر کرنے میں بہت وقت لگے گا۔ اُس نے ہنستے ہوئے جواب

دیا ۵۰۰ نہیں ٹوٹل ۱۸۲ مسافر ہیں جن کے پاسپورٹ اسٹیمپ کرتے ہوئے اُنہیں یقیناً زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

امیگریشن افسر کی بات ٹھیک تھی۔ سبھی مسافروں کے پاسپورٹ ۴۵ منٹ میں اسٹیمپ ہو گئے۔ اتنا وقت بھی اس لئے لگا کہ وہ ہر مسافر کے پاسپورٹ پر ویزا اسٹیمپ پر ہاتھ سے "۸ گھنٹے کے لئے" کے الفاظ لکھ رہے تھے۔ اِس لئے امیگریشن کا عمل قدرے سست روی سے چلا۔ اِس دوران پتہ چلا کہ ایئر پورٹ سے ہوٹل جانے کے لئے آدھ گھنٹہ درکار ہو گا۔ مجھے آدھ گھنٹہ ڈرائیو کر کے ہوٹل جانا اور پھر دو تین گھنٹے بعد واپس ایئر پورٹ آنا بے معنی عمل دکھائی دیا۔ ہم یہ وقت ایئر پورٹ پر ہی گزار سکتے تھے۔ ایئر پورٹ پر کیفے موجود تھے۔ ناشتہ وہیں ہو سکتا تھا۔ صرف ناشتے کے لئے آدھ گھنٹہ سفر کر کے چند گھنٹوں کے لئے کسی ہوٹل جانا اور پھر واپس لوٹنا۔۔۔آخر اتنا کشٹ کاٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ مسافر تو شک کا اظہار کر رہے تھے کہ آج کوئی جہاز اُنہیں لینے آئے گا۔ اُن کا خیال تھا کہ آج رات اُنہیں یہیں ہوٹل میں گزارنا ہو گی اور کل صبح تک قاہرہ جانے کا بندوبست ہو سکے گا۔

بہر حال ایئر لائن انتظامیہ کے فیصلے کا احترام کئے بغیر کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا اِس لئے سب مسافر چپ چاپ امیگریشن کے عمل سے گزر کر باہر کھڑی بسوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

تین بسوں میں بھرے مسافر آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد ایئر لائن انتظامیہ کے مطلوبہ ہوٹل پر پہنچے۔ وہاں برنچ کا سامان چنا گیا تھا۔ سب نے برنچ کھایا۔ برنچ کے بعد سب کو چند گھنٹے آرام کرنے کے لئے کمرے کی چابیاں تھما دی گئیں۔

میں گزشتہ سولہ سترہ گھنٹے سفر میں ہونے کی وجہ سے خاصہ تھک چکا تھا۔ اِس لئے میں نے ہسپانوی نوجوان اور امریکی لڑکی کے ساتھ شہر کی سیر پر جانے سے معذرت کی اور کمرے میں جا کر تھوڑا استانے اور گرم پانی سے غسل کرنے کو ترجیح دی۔

ہسپانوی نوجوان اور امریکی لڑکی کو خدا خافظ کہہ کر میں کمرے میں جا کر بستر پر لیٹا تو تھکن کی وجہ سے جلد ہی نیند آ گئی۔ گھنٹہ ڈیڑھ سویا ہوں گا کہ فون کی گھنٹی سے آنکھ کھل گئی۔ فرنٹ ڈیسک سے ریسپشنسٹ بول رہی تھی۔" سر لنچ کھلایا جا رہا ہے اور ٹھیک ڈھائی بجے بس ائرپورٹ کی طرف روانہ ہو جائے گی۔"

گھنٹے ڈیڑھ کی نیند اور گرم پانی سے غسل نے خاصہ خوشگوار اثر مرتب کیا۔ طبعیت تقریباً بحال ہو گئی۔ تیار ہو کر نیچے پہنچا تو ہسپانوی نوجوان اور امریکی لڑکی دونوں لنچ ہال میں موجود تھے۔ میرے استفسار پر اُنہوں نے بتایا کہ میرا اُن کے ساتھ نہ جانے کا فیصلہ بہتر تھا۔ کیونکہ ہوٹل کے اِرد گرد کے علاقے میں کوئی قابلِ دید چیز نہیں تھی۔ وہ یونہی چند میل پیدل چلنے کے بعد واپس لوٹ آئے تھے۔

لنچ سے فارغ ہو کر ہم سب اُنہی بسوں پر سوار ہو کر واپس ائیر پورٹ پہنچے تو ایجپٹ ائیر لائن کا جہاز قاہرہ روانگی کے لئے تیار کھڑا تھا۔

سب مسافروں کو نئے جہاز کے لئے نئے بورڈنگ پاس جاری کئے گئے۔ مسافر دوبارہ سیکورٹی سے گزر کر گیٹ پر پہنچے تو اُنہیں فوراً جہاز پر بٹھا دیا گیا۔ پھر بھی اِس سارے عمل میں شینن میں رات کے ساڑھے سات بج گئے جس کا مطلب تھا کہ قاہرہ میں رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ شینن سے قاہرہ کا پانچ سوا پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ اِس کا مطلب تھا کہ ہم رات دو تین بجے قاہرہ پہنچیں گے۔

رات کے دو تین بجے قاہرہ پہنچنا کوئی خوش گوار صورتِ حال نہیں تھی۔ لیکن اِس کے سوائے کوئی چارہ کار بھی تو نہیں تھا۔ چنانچہ خاموشی سے جہاز میں سوار ہو گئے۔ اِس جہاز کے عملے نے بھی نہائت خندہ پیشانی اور جاں افشانی کے ساتھ مسافروں کو اُن کی سیٹوں پر بیٹھنے میں مدد دی۔ اِس طرح معمول کی کاروائی کے بعد جہاز شیڈول کے وقت کے مطابق رات آٹھ بجے کے قریب قاہرہ روانہ ہوا۔

اس بار میرے ساتھ ایک نوجوان مصری امریکن بیٹھا تھا۔ وہ کسی بین الاقوامی نیوکلیئر کانفرنس کے لئے کویت جارہا تھا۔ لیکن کویت جانے سے پہلے ایک ہفتہ مصر میں اپنے عزیزواقارب سے ملنا ملانا چاہتا تھا۔ وہ ایک روشن خیال مصری تھا۔ جسے اسلامی دنیا میں مسلسل بڑھتی ہوئی انتہا پسندی پر بہت تشویش تھی۔

بیرون ملک رہنے والے پاکستانیوں کے طرح وہ بھی مصر کے اندرونی حالات کے بارے میں متفکر رہتا تھا۔ اُس کا دل اپنے ہم وطنوں کی زبوں حالی، پسماندگی اور مسائل پر دکھتا تھا۔ بیرونِ ملک رہنے والے پاکستانیوں کی طرح وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی کس طرح مدد کر سکتا ہے۔

اُس کی باتیں سن کر مجھے لگا میں کسی مصری امریکن سے نہیں بلکہ کسی پاکستانی امریکن سے بات کر رہا تھا جو مصر کی نہیں پاکستان کی بات کر رہا تھا۔

اُس نے مجھے مصر میں اپنے قیام کے بارے میں بہت اچھے مشورے دیئے۔ وہ مشورے بھی تقریباً وہی تھے جو ایک پاکستانی کسی غیر ملکی سیاح کو پاکستان کے بارے میں دے سکتا ہے۔

اُس سے گفتگو اور مشوروں سے مجھے اندازہ ہوا کہ پاکستان اور مصر ثقافتی طور پر کتنے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

اُس مصری ہمسفر کے ساتھ پاکستان، مصر اور اسلامی دنیا کی عمومی صورتِ حال پر گفتگو کرتے ہوئے باقی ماندہ سفر کا پتہ نہ چلا۔

ہمارے اندازے کے عین مطابق جہاز صبح پونے تین بجے قاہرہ انٹر نیشنل ائیر پورٹ پر اُترا سب مسافر جلدی سے جہاز سے اُترے اور امیگریشن ڈیسکس کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں نے بھی اپنا سامان اُٹھایا اور مصری اور ہسپانوی نوجوان اور امریکی لڑکی کو خدا حافظ کہہ کر امیگریشن کاؤنٹر کی طرف چل پڑا۔

میں نے امریکہ میں چونکہ مصری سفارت خانے سے ویزا نہیں لیا تھا اِس لئے میں نے امیگریشن ایریا میں داخل ہوتے ہی پہلے ویزا کاؤنٹر کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن مجھے اس سارے ایریا میں کہیں کوئی ویزا کاؤنٹر دکھائی نہ دیا۔ نہ ہی وہاں کوئی انفارمیشن کاؤنٹر دکھائی پڑا جہاں ویزا کے بارے میں انفارمیشن حاصل کی جاسکتی۔

البتہ وہاں مجھے کرنسی چینج کرنے والے تین بینک دکھائی پڑے۔ میں نے سوچا اس صورت میں پہلے کیوں نہ کرنسی تبدیل کی جائے اور پھر لگے ہاتھوں اُنہی سے ویزے کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جائیں۔

یہ سوچ کر میں جیسے ہی بینک کاونٹر پر پہنچا میں نے دیکھا وہاں ویزا کا سائن بھی لگا تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ بینک ہی پہلے سے ایک چھپی ہوئی ویزا اسٹمپ پندرہ ڈالر میں فروخت کرتا ہے۔ مجھے یہ اسٹیمپ ویزا کم اور مصر میں داخل ہونے کی فیس زیادہ دکھائی دی۔ وہ ایک عمومی اسٹمپ تھی جس پر مسافر کا نام یا پاسپورٹ انفارمیشن درج نہیں تھی۔

چناچہ پندرا ڈالر ادا کرکے ویزا اسٹمپ لینے کے علاوہ میں نے ایک ہزار امریکی ڈالروں کے مصری پاؤنڈ حاصل کئے۔ ایک ہزار امریکی ڈالروں کے عوض مجھے چھ ہزار مصری پاؤنڈ ملے۔

مصری پاونڈز کو مصری زبان میں گنی کہا جاتا ہے۔ لیکن گنی کا لفظ کم ہی استعمال ہوتا ہے۔ زیادہ تر کاروباری لوگ پاؤنڈ ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ شاید آپس میں گفتگو میں یا لین دین میں وہ گنی کا لفظ استعمال کرتے ہوں۔ تاہم اگر گنی کا لفظ استعمال کریں تو کسی کو الجھن نہیں ہوتی۔ سب جانتے ہیں کہ پاؤنڈز کا ذکر ہو رہا ہے۔

کرنسی تبدیل کر کے میں ساتھ ہی واقع امیگریشن کاؤنٹر پر پہنچا تو امیگریشن افسر نے کوئی سوال پوچھے بغیر پاسپورٹ پر اسٹمپ لگا کر پاسپورٹ میرے حوالے کر دیا۔ میں پاسپورٹ جیب میں ڈال کر کسٹم ایریا سے ہوتا ہوا پبلک ایریا میں چلا آیا۔

تب تک رات کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔ اِس کے باوجود کہ اُس وقت رات کا پچھلا پہر تھا مسافروں کو خوش آمدید کہنے کے لئے اُن کے عزیز و اقارب کی ایک بڑی تعداد ایئر پورٹ پر موجود تھی۔ جس سے ایئر پورٹ پر بہت رونق تھی۔ ساتھ ہی ٹیکسیوں والے مسافروں کو اپنی ٹیکسی میں بٹھانے کے لئے ہر باہر آنے والے مسافر سے پوچھ رہے تھے کہ اُسے کہاں جانا ہے۔ ایئر پورٹ پر یہ سین دیکھ کر مجھے لاہور یاد آیا۔ جہاں ایسے ہی بڑی تعداد میں لوگ اپنے عزیزوں کو لینے یا چھوڑنے ایئر پورٹ آتے ہیں اور ایسے ہی ٹیکسیوں والے زبردستی اُن کا سامان تک کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ اُنہیں اپنی ٹیکسی میں بٹھا کر اُس سے پیسے کمائیں۔

میں رات کے اِس وقت کسی ایسے ہی کسی ٹیکسی میں نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ اِس لئے میں مسافروں کے ہال میں واقع لیموزین کے کاؤنٹر پر چلا گیا۔ کم از کم لیموزین کا ایک کاؤنٹر تو تھا۔ ایک کاؤنٹر جس کا کوئی اتہ پتہ تھا۔ جہاں ایک کلرک بھی بیٹھا تھا۔

مجھے ائیر پورٹ سے ہوٹل کے کرائے کا اندازہ تھا۔ لیموزین والے نے ہوٹل کا نام سنتے ہی مجھے خود ہی کرایہ بتایا۔ کرایہ میرے حساب سے بالکل مناسب تھا اس لئے میں فوراہی لیموڈرائیور کے ساتھ اُس کی لیموزین میں ہوٹل جانے کے لئے سوار ہو گیا۔

سفیر ہوٹل قاہرہ کے ایک تقریباً نو آباد علاقے ڈکی میں واقع ہے۔عام لوگ اِس علاقے کو خالی ڈکی کہنے کی بجائے الدُکی کہتے ہیں۔

الدُکی ائیر پورٹ سے ۲۳ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ اگر سڑکوں پر رش نہ ہو تو ائیر پورٹ آنے جانے کے لئے ۱۵ سے ۲۰ منٹ کے قریب لگتے ہیں۔ اگر رش ہو تو پھر زیادہ وقت بھی صرف ہو سکتا ہے۔

رات کا پچھلا پہر ہونے کی وجہ سے سڑکیں ابھی تک خالی تھیں اس لئے لیموزین فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ ڈرائیور انگریزی سے بالکل نابلد تھا اور میں عربی سے۔ لیکن اِس کے باوجود ہم نے جلد ہی عربی کی بنیاد پر ایک ٹوٹی پھوٹی زبان فوری طور پر ایجاد کر لی۔

لیموڈرائیور کا نام محمود تھا۔ وہ شادی شدہ تھا۔ اُس کی تین بیٹیاں تھیں اور کوئی بیٹا نہیں تھا۔

میں نے جب اسے ٹوٹی پھوٹی عربی میں بتایا کہ میرے صرف دو بیٹے ہیں تو اُس نے مجھ سے اِس بات پر اظہارِ افسوس کیا کہ میری کوئی بیٹی کیوں نہیں ہے۔ اُس کا کہنا تھا کہ بیٹیاں خدا کی رحمت ہیں اور جتنی زیادہ ہوں خدا کی اتنی زیادہ رحمت۔

میں نے اُس سے اتفاق کیا لیکن ساتھ ہی مِکس فیملی کی بات کی تو وہ ہنس پڑا۔ پھر کہنے لگا ہاں بیٹے بھی ہونے چاہئیں۔

مصر میں رواج ہے کہ اگر آپ اکیلے مرد ہوں تو ٹیکسی یا لیمو میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھتے ہیں لیکن اگر آپ اکیلی خاتون ہوں تو پچھلی سیٹ پر بیٹھتی ہیں۔ چناچہ جیسا دیس ویسا بھیس کے کُلیہ کے

مطابق میں بھی محمود کے پہلو میں پیسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا اِس لئے ہم دونوں میں کوئی مشترکہ زبان نہ ہونے کے باوجود گفتگو آسانی سے چل رہی تھی۔

اپنی ظاہری ہیت میں قاہرہ مجھے پاکستان کے بڑے شہروں جیسا لگا۔ جگہ جگہ مجھے لاہور اور کراچی یاد آئے۔ بلکہ لاہور اور کراچی کے پوش علاقوں کو یاد کر کے مجھے ہلکا سا فخر محسوس ہوا کہ ہماری کرپٹ اشرافیہ نے چاہے اپنے لئے ہی سہی لیکن لاہور کراچی اور پاکستان کے دیگر شہروں میں کچھ علاقوں کو اتنا دیدہ زیب بنا دیا ہے کہ وہ کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے زیادہ بہتر ہیں۔

قاہرہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کے بیچوں بیچ دریائے نیل بہتا ہے۔ دریائے نیل لاہور کے پہلو میں بہنے والے راوی کی طرح سکڑ کر ایک گندے نالے میں تبدیل نہیں ہوا بلکہ شہر کے درمیان سے گزرنے کے باوجود پوری توانائی اور شان و شوکت کے ساتھ بہتا ہے۔

اگر نیل کے پانیوں کو بھی بھارت جیسا مصر کا کوئی ہمسایہ ملک کنٹرول کرتا اور اُس کے تعلقات بھی مصر کے ساتھ بھارت کے پاکستان کے ساتھ تعلقات جیسے ہوتے تو شاید نیل کا حال بھی آج راوی جیسا ہی ہوتا۔

بہر حال محمود نے جب مجھے سفیر ہوٹل پر اُتارا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ ہوٹل میں چیک اِن کے مراحل سے گزر کر میں ہوٹل کی نویں منزل پر واقع اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا تو فوراً نیند آ گئی اور میں ساڑھے نو بجے تک سویا رہا۔ بظاہر چار ساڑھے چار گھنٹے کی نیند نے مجھے تر و تازہ کر دیا لیکن راستے میں شینن میں رکنے کی وجہ سے ضائع ہونے والے وقت نے ایک طرف قاہرہ کے بارے میں میرے پہلے دن کے سارے منصوبے کو ختم کر دیا بلکہ جسمانی طور پر مجھے توڑ کر رکھ دیا۔

اصل منصوبے کے مطابق مجھے گزشتہ دن دوپہر کے ایک بجے قاہرہ پہنچنا تھا۔ قاہرہ پہنچ کر میں نے باقی ماندہ دن آرام کرنا تھا۔ اِرد گرد کے ماحول کا جائزہ لینا تھا۔ اگلے دن صبح آرام سے اُٹھ کر قاہرہ شہر کی دریافت پر نکلنا تھا اور اُسے آہستہ آہستہ خود پر عیاں ہونے دینا تھا۔ اُس کے گلی، محلّوں اور سڑکوں سے شناسائی حاصل کرنا تھی۔ لوگوں کو جاننا تھا۔ کھانے پینے والے اڈّوں کا جائزہ لینا تھا۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین کے قریبی اسٹیشن کا پتہ کرنا تھا۔ بسّوں کے نظام کو جاننا تھا۔ تاکہ قاہرہ میں اپنے مختصر قیام کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاسکوں۔

میری عادت ہے کہ میں جب کسی نئے شہر میں جاتا ہوں تو خود کو شہر کے ذرائع آمدورفت کے ذریعے شہر میں گم کر دیتا ہوں۔ یہاں تک کہ شہر مجھ سے ہم کلام ہونے لگتا ہے۔ اپنے اسرار کھولنے لگتا ہے۔ مجھے بتاتا ہے کہ میرے لئے اُس کے پاس کیا ہے۔ میں اُسے کیا دے سکتا ہوں اور وہ مجھے کیا دے سکتا ہے۔

لیکن قاہرہ ۱۳ گھنٹے کی تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے ایسا کچھ نہ ہوا۔ میں چار ساڑھے چار گھنٹے سو کر اٹھا، نہا دھو کر فارغ ہوا، تو ہوٹل کا فری لنچ کا وقت اختتام پذیر ہوا چاہتا تھا۔ چناچہ جلدی سے جا کر دوسرے فلور پر واقع ہوٹل کے ریستورانٹ میں ناشتہ کیا۔ ناشتہ ختم کرکے ہوٹل کی لابی میں آیا تو ہوٹل میں واقع ٹریول ایجنسی کے ایک کاؤنٹر پر نظر پڑی۔ ہوٹل کے ڈیسک کلرک نے مجھے چیک اِن کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ ٹریول ایجنسی والے لوکل ٹورز کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔

چناچہ ٹریول ایجنسی کے کاؤنٹر پر گائیڈڈ ٹور کا پتہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ ۵۰۰ مصری پاونڈز کے عوض گیزا، میمفس اور سکارا پیرامڈز ۔۔۔ جنہیں مصری اہرامِ مصر اور ان کی پیروی میں ہم بھی اہرام مصر ہی کہتے ہیں ۔۔۔ کا ٹور فراہم کرتے ہیں جس میں لنچ بھی شامل ہوتا ہے- ۵۰۰

مصری پاؤنڈ کا مطلب تھا تقریباً یو ایس اے کے پچھتر ڈالر۔ سودا بُرا نہیں تھا اِس لئے میں نے فوراً ہاں کر دی۔ اُنہوں نے بھی فوری طور پر اپنا ایک گائیڈ اور ڈرائیور طلب کیا اور مجھے اُن کے ساتھ اہرام مصر کے ٹور پر روانہ کر دیا۔

قاہرہ میں پہلا دن

میرے گائیڈ کا نام تھا گمال۔ جیم کا گاف تلفظ کرنے کی وجہ سے جسے ہم جمال کہتے ہیں مصری اُسے گمال کہتے ہیں۔ اپنے نام کی مزید وضاحت کرتے ہوئے گمال نے جمال عبد الناصر کا حوالہ دیا۔ اوپر کسی جگہ میں نے مصریوں کے جیم کا گاف تلفظ کرنے کے بارے میں لکھا تھا۔ وہاں میں نے ایک سوال اٹھایا تھا کہ اگر جیم کسی لفظ کے درمیان واقع ہو تو پھر مصری کیا کرتے ہیں۔ اب مجھ پر کھلنے لگا تھا کہ جیم لفظ میں جہاں بھی واقع ہو مصری اسکا تلفظ گاف ہی کرتے ہیں۔ جمال گمال ہے اور خروج خروگ ہے تو مسجد مسگد ہے اور جمعہ گمعہ ہے۔ یہ عقدہ یوں کھلا کہ جیسے ہی ہم ہوٹل سے گیزا پیرامڈز کی طرف جانے کے لئے نکلے تو راستے میں میں نے گمال سے پوچھا کہ اگر وہ مجھ سے ایک جملے میں قاہرہ کو متعارف کرانا چاہے تو کیسے کرائے گا؟

اُس نے کہا قاہرہ میناروں کا شہر ہے۔ پھر اُس نے سڑک کے بائیں طرف ایک مسجد کا نام بتایا تو اُسے عائشہ کی مسگد کہہ کر پکارا۔ اُس سے مجھے اندازہ ہوا کہ مصریوں کو اس چیز کی کوئی پرواہ نہیں کہ جیم لفظ میں کہاں واقع ہوا ہے وہ اُس کا تلفظ گاف ہی کرتے ہیں۔ چناچہ میں نے بھی فوری طور پر اپنے ذہن میں جیم کو گاف سے تبدیل کر دیا اور اپنی گفتگو میں ایسے کسی بھی لفظ کو گاف سے تلفظ کرنا شروع کر دیا جس میں جیم واقع ہوتا تھا۔

گمال تیس پینتیس برس کا نوجوان تھا۔ پکارنگ۔ بولتی ہوئی ذہین آنکھیں۔ اور گفتگو کا محتاط لہجہ اُس کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اُس نے مجھ سے اپنا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ اُس نے ہوٹل اور ٹور مینجمینٹ میں قاہرہ یونیورسٹی سے ایم اے کر رکھا ہے۔

اِس سے مجھے اندازہ ہوا کہ مصری گورنمنٹ سیاحت کو کتنی اہمیت دیتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا سے ٹورسٹ مصر کھنچے چلے آتے ہیں جس سے مصری حکومت کو بے پناہ زرِ مبادلہ کمانے کا موقع ملتا ہے۔

کمال نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اُس کی بیوی ہانگ کانگ سے ہے۔ اُس میں سے اُس کا ایک بیٹا ہے جس کا نام یاسین ہے۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ شادی کرنے ہانگ کانگ کیسے پہنچ گیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ہانگ کانگ نہیں گیا تھا بلکہ اُس کی بیوی سیر وسیاحت کے لئے ہانگ کانگ سے مصر آئی تھی۔ میں اُس کا ٹور گائیڈ تھا۔ وہ مجھے اچھی لگی۔ میں اُسے اچھا لگا۔ اُس نے مجھے اپنا ایڈریس دیا۔ تب تک یہاں اِی میل کا رواج نہیں تھا۔ تقریباً ایک مہینے میں خط آتا جاتا تھا۔ وہ مجھے محبت بھرے خط لکھتی میں اُسے لکھتا۔ یہاں تک کہ ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

ہمارے ڈرائیور کا نام ابراہیم تھا۔ ابراہیم سابقہ فوجی تھا۔ اُس کا تعلق مصری فوج کے پیراٹروپر یونٹ سے تھا۔ ۱۹۷۳ کی اسرائیل مصر جنگ میں جبکہ وہ جہاز سے چھلانگ لگا کر اسرائیل میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا ٹانگوں پر اسرائیلی فوجیوں کی گولیاں لگنے سے زخمی ہو کر گرفتار ہوا تھا۔ اُس کے بعد وہ تین ماہ تک اسرائیل کی جیل میں رہا۔ وہیں اُس کا علاج ہوا۔ جنگ بند ہونے کے بعد جب قیدیوں کا تبادلہ ہوا تو اُس میں اُس کی رہائی ہوئی۔

اب تک میرا مصر میں جن چند ایک مصریوں سے تعارف ہوا میں نے نوٹ کیا کہ مصریوں کے نام ہماری طرح غیر عرب نام تھے۔ غیر عرب سے میری مراد ہے کہ وہ عربوں کی طرح فلاں بن فلاں نہیں کہلاتے بلکہ پاکستانیوں کی طرح بن کا اضافہ کئے بغیر اپنا نام استعمال کرتے ہیں۔

کمال نے ابراہیم کو جادوگر کالقب دے رکھا تھا۔ ابراہیم وضع قطع سے کلاس کا آدمی لگتا تھا۔ سیاہی مائل گندمی رنگ چھریرا بدن اوپر کالے رنگ کا چمکدار سلکی سوٹ اور گولڈ رنگ کی نکٹائی اور سیاہ چشموں کی عینک۔ لگتا تھا اپنی خوب دیکھ بھال کرتا ہے۔مارچ کے نیم سرد دن میں صحرا کے لئے یہ لباس مناسب تھا۔ اِس لباس سے اُس کا پروفیشنلزم جھلکتا تھا۔

میں نے کمال سے ابراہیم کو جادوگر لقب دینے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔ جب ہم پیرامڈز کے قریب پہنچیں گے تو دیکھنا کہ وہ کس طرح پیرامڈز کو کبھی سڑک کے دائیں اور کبھی بائیں طرف کر دے گا۔

میں نے کہا اگر یہ جادو ہے تو میں امریکہ میں روزانہ صبح اِس سے بڑا جادو کرتا ہوں کیونکہ میں صبح کام پر جاتے سورج کو کبھی سڑک کے دائیں اور کبھی بائیں طرف کر دیتا ہوں۔

کمال اور ابراہم دونوں میری بات سن کر ہنسنا شروع ہو گئے۔ کہنے لگے ہاں پیرامڈز تو اِس زمین پر ہیں آسمان پر سورج کو دائیں بائیں کرنا بڑی بات ہے۔

بہر حال اسی طرح خوش گپیاں کرتے ہم تینوں صبح کے گیارہ بجے کے قریب قاہرہ کی سڑکوں پر شہر کے بیرونی حصے کی طرف رواں دواں تھے۔ دن خوب چمک رہا تھا۔ شہر کے اِس حصے میں سڑک کے دونوں طرف کئی کئی منزلہ اینٹوں کی بنی عمارتیں ایستادہ تھیں۔ بظاہر تمام عمارات کا اسٹرکچر کھڑا تھا لیکن عمارات دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی تک اُن کی فنشنگ نہیں ہوئی اور وہ رہائش کے قابل نہیں ہیں۔

کمال نے مجھے بتایا کہ نئے قاہرہ میں غیر قانونی کنسٹرکشن کا کام بہت زیادہ ہے۔ یہ سب عمارات غیر قانونی طور پر تعمیر کی گئی ہیں۔ غیر قانونی ہونے کے باوجود اُنہیں گرایا نہیں جا سکتا۔ حکومت نے قانون بنا رکھا ہے کہ ایسی کسی غیر قانونی عمارت کو اگر اُس میں کوئی فیملی رہ رہی ہو تو گرایا

نہیں جائے گا اور نہ ہی اُس پر مالکان کو پراپرٹی ٹیکس دینا پڑے گا- چناچہ قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لئے مالکان کسی ایک فلور پر کسی فیملی کو رہائش دے کر ایک طرف ٹیکس بچاتے ہیں اور دوسری طرف اپنی غیر قانونی تعمیر کو تحفظ دیتے ہیں۔

کمال کی بات سن کر مجھے پھر پاکستان یاد آیا۔ کیا کچھ مشترک ہے دونوں ممالک میں۔ ایک طرف دونوں ممالک سرمایہ دارانہ نظام کی ریشہ دوانیوں سے تار تار ہو رہے ہیں اور دوسری طرف دونوں ممالک میں اشرافیہ کس طرح حیلوں بہانوں سے قانون کا بازو اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مروڑتی ہے۔

اِنہی باتوں میں ہم قاہرہ کی حدود سے نکل کر قاہرہ کے مغربی صحرا کی حدود میں داخل ہو گئے۔ ہمارے ایک ہاتھ وادی نیل کے خوبصورت مرغزار تھے اور دوسری طرف صحرا تھا۔

صحرائی حدود میں داخل ہوتے ہی سڑک سے گیزا کی تینوں پیرامڈز سطحِ صحرا پر سینہ تانے کھڑی دکھائی دیں۔

دنیا کا ساتواں عجوبہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ ہم بچپن سے اِن پیرامڈز کے بارے میں پڑھتے آئے تھے۔ کبھی سوچا نہیں تھا کہ زندگی میں ایک دن یہ پیرامڈز بالمشافہ دیکھنے کا موقع ملے گا۔

ان پیرامڈز میں سے بڑی اور اونچی پیرامڈ کو خوفو کی پیرامڈ کہا جاتا ہے۔ یہ حیرت انگیز حد تک ابھی تک بہتر حالت میں ہے۔ اس کی تعمیر فرعون مصر خوفو کے دور میں ۲۵٦۰ قبل مسیح میں تقریبا بیس سال میں تعمیر ہوئی۔ اِس کی اونچائی تقریبا ۵۰۰ فٹ ہے۔ اِسے چار ہزار سال تک زمین پر انسانوں کا بنایا ہوا بلند ترین اسٹرکچر ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔

ماڈرن دور میں کئی ایک اس سے بلند تر عمارات کی تعمیر ہونے سے اِس کا بلند ترین اسٹر کچر ہونے کا اعزاز چھن گیا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ دورِ جدید میں انسانوں کو جو تکنیکی اور مشینی معاونت اور مہارت حاصل ہے وہ اس پیرامڈ تعمیر کرنے والوں کو حاصل نہیں تھی۔ اِس کے علاوہ پیرامڈ کی تعمیر میں جتنے بھاری بھر کم پتھر استعمال ہوئے دورِ جدید میں اتنے بھاری بھر کم عناصر کو اٹھانے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے مشینری موجود ہے جب کہ ۲۵۶۰ قبل مسیح میں یہ مشینری موجود نہیں تھی۔

تصویر میں گزا پر واقع تینوں پیرامڈز ایک ساتھ نظر آ رہی ہیں

گِزا پر واقع پہلی اور بلند ترین پیرامڈ

اس پیرامڈ کے نیچے تین چیمبر ہیں ایک فرعون مصر کے لئے ایک اُس کی ملکہ کے لئے لیکن تیسرا چیمبر اُدھورا ہے۔

میں نے کمال سے اتنے بھاری بھر کم پتھروں کی ٹرانسپورٹیشن کے بارے میں وہی سوال پوچھا جو سائنس اور ٹکنالوجی کے ایکسپرٹ صدیوں سے پوچھتے چلے آرہے ہیں کہ آخر اتنے بھاری پتھر کہاں سے اور کیسے اس جگہ لائے گئے؟

کمال نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے مجھے بتایا کہ اِس بات کی علامات موجود ہیں کہ اُس زمانے میں دریائے نیل اِس علاقے میں بہتا تھا۔ دریائے نیل کے ذریعے ہی اتنے بھاری بھر کم پتھر اِس مقام پر لائے گئے اور پھر اِنہیں ریت پر گھسیٹ کر اِس جگہ تک پہنچایا گیا۔ جہاں ایک ایک پتھر کو تراش کر اِس کی جگہ پر رکھا گیا۔

پتھروں کی ٹرانسپورٹیشن تو ایک مسئلہ ہے ان پرامڈز کی تعمیر نے جدید دور کے سائنس دانوں کے لئے کئی ریاضیاتی اور انجینئرنگ کی گتھیوں کو جنم دے رکھا ہے۔

سائنس دان ابھی تک ان پیرامڈز کی تعمیر کی یہ گتھیاں سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن تاحال تشفی بخش حد تک وہ اِن گتھیوں کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

کمال نے جب مجھے دریائے نیل کے راستہ بدلنے کی کہانی سنائی تو میں نے لگے ہاتھوں بچپن سے مولویوں سے سنی حضرت عمر کے دریائے نیل کے نام لکھے گئے خط کی کہانی اُسے سناڈالی۔

کہانی کے مطابق ہر سال نیل کو خوش رکھنے کے لئے مصری کسی نوجوان لڑکی کی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے تاکہ دریائے نیل اسی طرح بہتا رہے۔

حضرت عمر نے جب اِس رسم کے بارے میں سنا تو اُنہوں نے اِس رسم پر پابندی لگا دی اور نیل کے نام ایک خط لکھ کر مصریوں کو دیا کہ اب لڑکی قربان کرنے کی بجائے میرا خط دریائے نیل میں ڈالا جائے۔

کمال نے واقعہ سننے کے بعد کہا کہ مصر کی تاریخ میں کبھی کسی دیوی یا دیوتا کے لئے انسانی جان کی قربانی کا ذکر نہیں ملتا۔ ہاں جانوروں کی قربانی کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ اس لئے دریائے نیل کے لئے کسی خاتون کی قربانی کا واقعہ نہ صرف غلط ہے بلکہ حضرت عمر کا ایسا کوئی خط لکھنا بھی تاریخی طور پر غلط ہے کیوں کہ تاریخ کی کسی مستند کتاب میں ایسے کسی خط کا ذکر نہیں ملتا۔

کمال جب یہ بات کر رہا تھا تو میں فراعنہ مصر کی ذمہ داریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فراعنہ مصر اپنے ملک میں تمام طاقتوں کا سرچشمہ سمجھے جاتے تھے۔ وہ ایک طرف سیاسی طور پر ملک کے حکمران تھے تو دوسری طرف تمام مذہبی طاقتوں کا مرکز بھی تصور کئے جاتے تھے۔ اُن کی ذمہ داریوں میں سے ایک دریائے نیل میں ہر سال آنے والے سیلابوں کا بندوبست تھا۔ کیونکہ یہ سیلاب اپنے ساتھ بالائی افریقی ممالک سے سِلٹ لاتے تھے جس سے نیل کے ڈیلٹا کی زرخیزی قائم رہتی تھی اس لئے اہلِ مصر فرعونِ مصر سے توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنی مذہبی حیثیت کو استعمال کرتے ہوئے اپنے وقت پر سیلاب کی آمد کا اہتمام کرے گا۔ اس اعتبار سے اگر اہل مصر نے اپنے نئے حکمران حضرت عمر سے ایسے سیلاب لانے کی توقع قائم کی ہو تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

اُن کے ذہن میں ایک حکمران کا تصور فرعونِ مصر کا تصور تھا۔ حضرت عمر جیسے کسی حکمران کا تصور نہیں تھا۔ چناچہ اگر حضرت عمر نے دریائے نیل کے نام ایسا کوئی خط لکھا ہو تو وہ اُس وقت

کے مصر کے تصورِ حکمرانی میں فٹ ہوتا ہے۔ جس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حضرت عمر بہت عملی انسان تھے اور ایسی روایات کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے۔

خوفو کی پیرامڈ کے ساتھ ہی دو اور پیرامڈز ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ پیرامڈز خوفو کی دوسری بیویوں کے لئے تعمیر کی گئی تھیں۔ پیرمڈز کیوں تعمیر کی گئی تھیں اس کا تعلق دراصل اس وقت کے مصریوں کے حیات بعد الموت کے عقیدے سے تھا۔

اُس وقت مصریوں کا عقیدہ تھا کہ موت سے زندگی ختم نہیں ہوتی بلکہ جاری رہتی ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق انسان کو موت کے عمل سے گزرنے کے بعد ایک اور جسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے یہ پیرامڈز اور پتھروں کے مقبرے بنائے جاتے تھے۔

خاص طور پر اُن کا عقیدہ تھا کہ بادشاہ مرنے کے بعد مردوں کے بادشاہ بن جاتے ہیں۔ اُنہیں اپنی معاونت کے لئے ہر وہ چیز چاہئے ہوتی ہے جو وہ اپنی زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ چناچہ اُن کو متبادل جسم فراہم کرنے کے لئے اُن کے مقبروں میں اُن کا مجسمہ رکھا جاتا تھا اور پیرامڈز کے اندر بنائے گئے چیمبرز پر تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ اِن تصویروں میں تقریباً ہر وہ چیز موجود ہوتی ہے جن سے بادشاہ کا تعلق رہا ہوتا ہے۔ اس طرح بادشاہ کا کام اُس کے مرنے کے بعد بھی چلتا رہتا ہے۔

اِن تینوں پیرامڈز سے ذرا نیچے ابوالہول کا مجسمہ ہے۔ ابوالہول کی کہانی ہم سب تک کئی طریقوں سے پہنچی ہے۔ ہم سب ابوالہول کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔

ابو الہول کا مطلب ہے دہشت کا باپ۔ یعنی جسے دیکھ کر انسان کو ہول آئیں یا انسان پر دہشت طاری ہو جائے۔ ابو الہول کا دھڑ ایک بیٹھے ہوئے شیر کا اور چہرا ایک انسان کا ہے۔ ابو الہول کو دیکھ کر واقعی انسان کو ہول آتا ہے۔

آج سے ساڑھے چار ہزار سال پہلے جب اِسے بنایا گیا تھا اور جس جگہ بنایا گیا تھا اُس کی موجودگی کسی بھی چور اچکے یا ڈاکو کو اِن پیرامڈز کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لئے کافی تھی۔ لیکن ابو الہول کو بنانے کا مقصد پورا نہ سکا۔ کیونکہ چوروں ڈاکوں نے جلد ہی فراعنہ کے لئے ان پیرمڈز کے چیمبرز میں رکھی اشیا چرانا شروع کر دیں۔ مصریات کے شعبے میں مہارت رکھنے والے تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ پیرامڈز کی لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ اُن کے بنائے جانے کے کچھ عرصہ بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔

گزا پیرامڈز کے پاس بنا ابوالہول

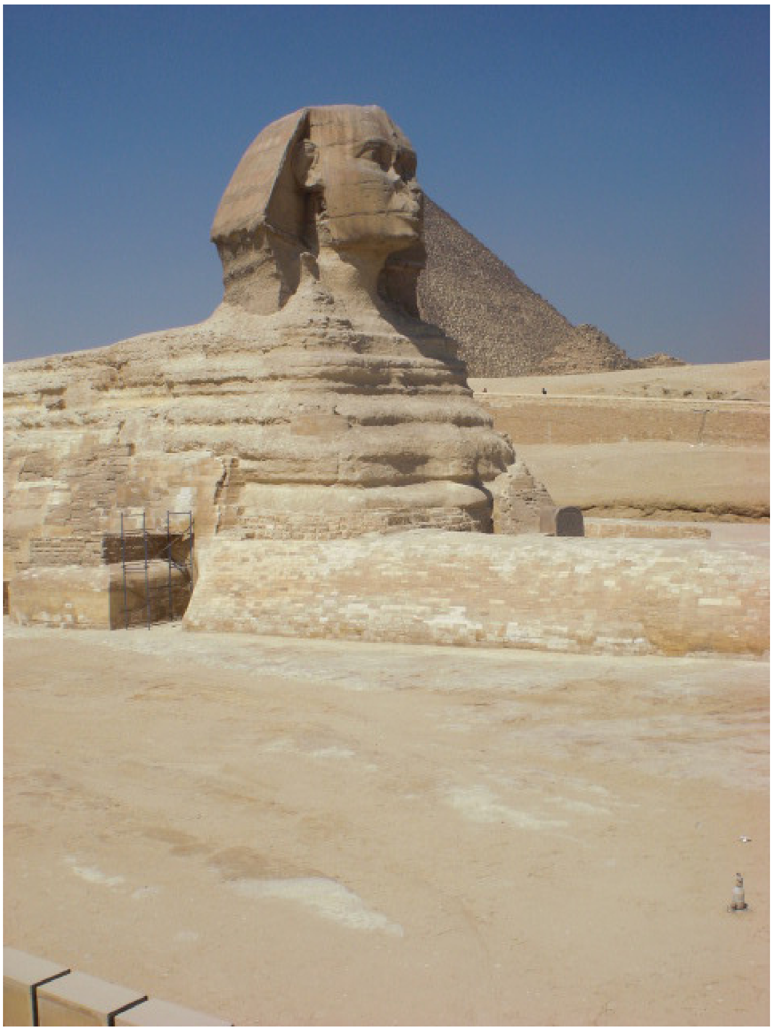

ابوالہول کا ایک اور منظر

معروف یونانی تاریخ دان ہیروڈوٹس نے ۵ صدی قبل مسیح میں مصر کا سفر کیا تھا۔ اُس نے لکھا ہے کہ اُس سفر کے دوران اُس نے مصر میں پیرامڈز کی لوٹ مار کی بہت سی کہانیاں سنیں۔ اُن کہانیوں ہیروڈوٹس کو بتایا گیا کہ کس طرح پیرامڈز کے ارد گرد کے دیہاتی علاقوں کے لوگ پیرامڈز سے مردہ فرعونوں کے لئے رکھے گئے قیمتی نوادرات اور کھانے پینے کی اشیا وہاں سے غائب کر دیتے ہیں۔

گزا پیرامڈز مصر میں بنی پہلی پیرامڈز نہیں ہیں۔ ان کا ذکر اس سفر نامے میں پہلے اس لئے آ گیا ہے کیونکہ کمال اور ابراہیم پہلے مجھے یہیں لے گئے تھے۔ لیکن زمانی طور پر گزا پیرامڈز سے تقریباً ایک صدی قبل سکارا پیرامڈز بنائی گئی تھیں۔ سکارا پیرامڈز گیزا پیرامڈز سے کوئی پچیس کلو میٹر دور ہیں۔

کمال نے مجھے پیرامڈز کے اندر بنے چیمبرز میں جانے کی دعوت دی لیکن میں نے دانستہ ان کے اندر جانے سے گریز کیا۔ کیونکہ ان چیمبرز تک اترنے کے لئے جس جسمانی انرجی کی ضرورت تھی وہ مجھ میں نہیں تھی۔ دوسرے کمال نے مجھے بتایا کہ جو چیمبر ان پیرامڈز کے نیچے بنے ہیں بالکل ویسے ہی چیمبر سکارا پیرامڈز کے پاس سطح زمین پر موجود ہیں۔

گزا پیرامڈز کے ساتھ کچھ تصویریں بنانے کے بعد ہم سکارا پیرامڈز کی طرف روانہ ہوئے۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے سکارا پیرامڈز گزا پیرامڈز سے تقریبا ایک صدی پہلے بنائی گئی تھیں۔ پیرامڈز کی تعمیر کے زمانے کی نشاندہی کرتے ہوئے لائبریری آف کانگرس کے ریسرچ پیپرز میں لکھا ہے کہ فرعونوں کی تیسری سلطنت کے دور میں مصر آئندہ پانچ سو سال کے لئے پیرامڈز کے دور میں داخل ہوا۔ اِن ریسرچ پیپرز کے مطابق سکارا پیرامڈز کی تعمیر کا سہرا اُس

وقت کے فرعون ڈیجسور کے ایڈوائزر امہوٹپ کے سر ہے۔ اُس نے فرعون ڈیجسور کے لئے جنازہ گاہ، اُس کا مقبرہ اور اسٹیپ پیرامڈ تعمیر کرائی۔ اس تعمیر میں اُس کی ذہانت کا اظہار اِن

فرعون مصر ڈیجسور کے لئے اُس کے ایڈوائزر امہوٹپ
کی بنائی گئی جنازہ گاہ

فرعون مصر ڈیجسور کے لئے امہوٹپ کی جنازہ گاہ کا اندر سے منظر
دکھائی دینے والے کالم اور پیجنل ہیں

کی تعمیر کے لئے استعمال ہونے والے چونے کے پتھر اور اُن کے ڈیزائین سے واضح طور پر ہوتا ہے۔

اس کے بعد فرعون سنریفو اور اُس کے بیٹے خوفو نے گزا کی حقیقی پیرامڈز تعمیر کرائیں جنہیں پرانی دنیا کا ساتواں عجوبہ کہا جاتا ہے۔

خوفو کی پیرامڈ میں بیس لاکھ سے زیادہ پتھر استعمال کئے گئے ہیں۔ اِن میں سے کئی ایک پتھر وزن میں پندرہ ٹن سے بھی زیادہ بھاری ہیں۔

ہو سکتا ہے آج کے زمانے میں اِن پیرامڈز کی تعمیر کو ایک کارِ بیکار سمجھا جائے لیکن اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مصر کے فرعونوں کی تہذیب کے ارتقا میں اِن پیرامڈز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

گزا سے جب ہم سکارا جانے کے لئے نکلے تو کمال نے مجھے چائے پانی کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کمال سے اتفاق کرتے ہوئے جواب دیا کہ اِس تھکن کے ساتھ چائے پانی کے لئے رُکنا بہت اچھا خیال ہے۔

میرا جواب سُن کر ابراہیم نے گاڑی ایک سائڈ روڈ پر ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک کیفے کے سامنے رُکے۔ ابراہیم نے گاڑی سڑک پر پارک کی اور ہم کیفے کے اندر چلے گئے۔

دس منٹ کیفے میں رُک کر میں نے چائے جبکہ کمال اور ابراہیم نے پیپسی کا ایک ایک ڈرنک لیا۔ کیفے سے نکلے تو مجھے سامنے والے بزنس پر پائپرس کا سائن لگا دکھائی دیا۔ میں نے کمال سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ کمال نے کہا یہ ایک پیپر کمپنی ہے جہاں مصر کے کلاسیکی طریقے سے پیپر بنانے کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ ساتھ اُس کاغذ پر بنے مصری آرٹ کے نمونے ہیں جنہیں فروخت کے

لئے رکھا گیا ہے۔ میں نے یہ تو سنا تھا کہ پیپر درختوں سے بنایا جاتا ہے لیکن کیسے بنایا جاتا ہے اِس کا مظاہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے کمال سے درخواست کی کیا یہ ممکن ہے کہ ہم پیپر بنانے کا عملی مظاہر دیکھ سکیں۔ کمال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ یہ بالکل ممکن ہے۔ اِس کے لئے ہمیں کوئی ٹکٹ بھی نہیں خریدنا پڑے گا۔

میرے کہنے پر کمال مجھے پیپر کمپنی کے اندر لے گیا۔ ایک خوبصورت مصری خاتون نے دروازے پر ہمارا استقبال کیا۔ خاتون کے چہرے سے معصومیت اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ اُس نے اپنا تعارت کراتے ہوئے اپنا نام بتایا جسے میں زیادہ دیر تک یاد نہ رکھ سکا۔

اُس خاتون نے ایک کاونٹر پر جا کر ایک ڈیڑھ دوڈھائی فٹ کا پتلا سا پودہ اُٹھایا۔ اس کا تنا سبز تھا اور تنے کے اوپر چند گچھے دار شاخیں تھیں۔

خاتون نے بتایا کہ اُس پودے کا نام پائپرس ہے۔ یہ وادیٔ نیل میں باافراط پیدا ہوتا ہے۔ مصری لوگ گزشتہ چار ہزار سال سے اِس پودے سے کاغذ بنااور استعمال کر رہے ہیں۔ پھر اُس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا مصری اُس وقت سے کاغذ بنااور استعمال کر رہے ہیں جب چینیوں کو کاغذ کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ پھر اُس خاتون نے اُس پودے کے تنے کا چھلکا اتار کر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ میں اپنی پوری طاقت سے کھینچ کر اُسے توڑنے کی کوشش کروں۔ میں نے خاتون کا دیا ہوا چھلکا دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر کھینچا تو وہ واقعی بہت مضبوط تھا۔ اُسے توڑنا ممکن نہیں تھا۔ پھر اُس نے پودے کا گودا لیا اور اُسے لکڑی کے ہتھوڑے سے کُوٹ کر فلیٹ کیا وہ ایک کاغذ کی پٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ اُس نے کہا ایسی پٹیاں بنا کر وہ چھ دن تک پانی میں رکھتے ہیں۔ اُس کے بعد اُن کی باہم دگر نٹنگ کر کے اُن کو پریس کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خشک ہو کر کاغذ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ۔

اُس نے کہا پرانے زمانے میں پریس کا کام فلیٹ سطح کے بڑے بڑے پتھروں سے لیا جاتا تھا جب کہ اب یہ کام مشینی پریسوں سے لیا جاتا ہے۔

پھر اُس نے مجھے اپنے عقب میں شیلفوں پر رکھی بہت سی تصویریں دکھائیں جو ایسے ہی کاغذ پر بنی تھیں۔ ایک تصویر پیرامڈز کے چیمبر پر بنی تصویروں جیسی تھی۔ تصویر میں چودہ انسان

پاپیرس کے مصری پودے

کھڑے تھے۔ ایک انسان باری باری ان کے سامنے پیش ہو رہا تھا۔ اور آخر میں ایک ترازو رکھا تھا جس کے پاس ایک چیتا نما جانور بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا یہ تصویر کیا ظاہر کرتی ہے۔ اُس نے کہا فراعینِ مصر کے زمانے میں لوگوں کا اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد یہ جاننے کے لئے کہ مرنے والا انسان اچھا ہے یا بُرا اُسے ایک ایک کر کے چودہ ججوں کے سامنے پیش ہونا پڑتا ہے۔ اگر زیادہ جج کہیں کہ وہ اچھا ہے تو اُسے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔ اگر زیادہ جج کہیں کہ وہ بُرا ہے تو اُس کو زندگی کا سفر آگے جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لیکن اگر ججوں میں ٹائی ہو جائے یعنی سات جج کہیں کہ وہ اچھا ہے اور سات جج کہیں کہ وہ بُرا ہے تو اُس کے دل کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جاتا ہے اور ایک پر دوسرے پلڑے میں رکھا جاتا ہے۔ اگر دل والا پلڑا اوپر اٹھ جائے تو اُس انسان کو اچھا ڈکلیر کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر دل والا پلڑا بھاری ہو تو پھر یہ چیتا نما جانور اُس دل کو کھا جاتا ہے اور اس انسان کی زندگی کا سفر ہمشہ کے لئے وہیں ختم ہو جاتا ہے۔

خاتون کی یہ کہانی دراصل فراعنہ مصر کے زمانے کے ایک تصور "مات" کی عملی تصویر تھی۔ "مات" موت کی وہ اسٹیج ہے جہاں مرنے کے بعد انسان کی زندگی جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا تعین کیا جاتا ہے۔ اِس مقصد کے لئے اُس کی شخصیت کے دو پہلوں یعنی "عدل" اور "سچائی" کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ اُس کی زندگی میں "عدل" اور "سچائی" کا کتنا دخل تھا۔

میں جب اُس خاتون سے ججوں والی تصویر کی یہ کہانی سن رہا تھا کمال اور ابراہیم ایک طرف کھڑے رہے۔

یہ کہانی سناتے ہوئے اس خاتون نے مجھے کہا جانتے ہو موسیٰ علیہ السلام جب چند ماہ کے بچے تھے تو ان کی ماں نے اُنہیں ایک ٹوکری میں لٹا کر دریائے نیل میں ڈال دیا تھا۔ وہ ٹوکری اسی پاپئرس کی بنی ہوئی تھی۔

پھر اُس نے کہا پرانے زمانے جب مصری کشتیاں بناتے تھے تو وہ اُن کو پاپئرس سے بنائی گئی رسیوں سے باندھتے تھے کیونکہ پانی پاپئرس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ اُس نے عملی طور پر اِس کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایک کاغذ کئی منٹ تک پانی کے اُوپر رکھا اور پھر کہا دیکھ لو اِس کی اُوپر والی سطح خشک ہے۔ یہ کاغذ جب تک چاہو پانی کے اُوپر رکھو پانی اِس میں جذب ہو کر دوسری طرف نہیں جاتا۔

یہ کہانی سنا کر اُس خاتون نے اسٹور میں رکھی سینکڑوں تصویریں دیکھنے کی مجھے دعوت دی۔ میں نے شاپ کا ایک راؤنڈ لگایا۔ ساری تصویریں مصری اسَاطیر کی تصویری شکلیں تھیں۔ میں نے ایک ایک تصویر بہت توجہ سے دیکھی۔ پھر میں خاتون سے رخصت لے کر شاپ سے باہر نکل آیا۔ کمال اور ابراہیم بھی میرے ساتھ باہر چلے آئے۔

ہم دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر سکارا پیرامڈز کے طرف چل پڑے۔ پندرہ بیس منٹ گاڑی چلانے کے بعد ہم سکارا جا پہنچے وہاں بھی تین پیرامڈز ہماری منتظر تھیں۔ لیکن یہ پیرامڈز دیکھنے میں گزا پیرامڈز سے مختلف تھیں۔ اِنہیں سیدھی ڈھلان میں بنانے کی بجائے اسٹیپس میں بنایا گیا تھا۔ سکارا پیرامڈز کو سٹیپ پیرامڈز کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اُوپر کی طرف اسٹپس میں اُٹھتی ہیں۔ جبکہ گزا پیرامڈز بغیر اسٹیپس کے ایک خاص زاویہ پر اُوپر تک بنائی گئی ہیں۔

اِس فرق کی وجہ سے گزا پیرامڈز کو حقیقی پیرامڈز کہا جاتا ہے جبکہ سکارا پیرامڈز کو اسٹیپس پیرامڈز کہتے ہیں۔

ایک اور بات جو میں نے سکارا پیرامڈز پر نوٹ کی ایک تو یہ کہ پہلی پیرامڈ کی پتھروں سے نیچے سے اُوپر تک مرمت کی جارہی ہے۔ جب کہ اُس کے پہلو میں واقع سکارا کی دوسری پیرامڈ صاف طور پر مٹی کے ایک تودے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اُسے دیکھ کر دیکھنے والے کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے۔۔۔ اور یہ سوال میرے ذہن میں بھی پیدا ہوا۔۔ کہ اِس کے ٹنوں وزنی پتھر کہاں گئے جب کہ باقی پیرامڈز کے

سکارامیں بنی پہلی پیرامڈ ا۔ یہ پیرامڈ گزا پیرامڈز سے تقریباً سو سال
پہلے تعمیر کی گئی تھی

پیرامڈز کے چیمبرز کی دیواروں پر بنی تصویریں

چیمبرز کی دیواروں پر بنی تصویریں

چیمبرز کی دیواروں پر بنی تصویریں

چیمبرز کی دیواروں پر لکھی تحریر

پتھر اپنی جگہ موجود ہیں۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیرامڈز باقاعدہ ارتقائی عمل سے گزر کر اِس شکل تک پہنچی تھیں۔

ہاں تو ہم بات کر رہے تھے اِن پیرامڈز کے نیچے بنے چیمبرز کی دیواروں پر بنی تصویروں کی۔ سکارا پیرامڈز کے اندر جانا منع تھا۔ کیونکہ اُن میں سب سے بڑی پیرامڈ کی مرمت ہو رہی تھی۔ اُس کے نیچے سے لے کر اوپر تک اسکیفل لگے تھے۔ دوسری والی ویسے مٹی کا تودہ دکھائی دے رہی تھی۔

لیکن سکارا پیرامڈز کے بالکل پہلو میں ایک اسٹرکچر تھا جسے فیونری کا نام دیا گیا تھا۔ فیونری بڑے بڑے پتھروں سے بنی ایک دیوار تھی جس میں داخل ہونے کا ایک دروازہ تھا۔ دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی دونوں طرف بیس بیس فٹ اونچے پلر تھے جن پر سالڈ چھت تھی۔ یہ اسٹرکچر بھی پیرامڈز جتنا ہی پرانا تھا۔ ان پلرز کے بیچوں بیچ چلتے ہم بڑی پیرامڈ کے بالکل سامنے پہنچ گئے۔ وہاں ایک ریتلا میدان تھا۔ میدان کے ساتھ کچھ سیڑیاں زمین کے اندر چلی گئی تھیں اُن میں اُترے تو ہم زمین کے اندر تین چیمبرز کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ چیمبرز بالکل ایسے ہی تھے جیسے پیرامڈز کے نیچے فراعین کے چیمبرز تھے۔ یہ شاید اُن کے قریبی کارپردازوں کے چیمبر تھے۔ اِن چیمبرز پر بھی ویسی ہی اسَاطیری تصویریں بنی تھیں جو اُس وقت کے مصریوں کے حیات و موت کے فلسفے کی کہانی کہہ رہی تھیں۔

شاید مرنے والوں کے عقیدے کے مطابق اب اِن میں سے کتنوں کی روحیں اِن تصویروں میں رہ رہی تھی۔

ہم سکارا سے نکلے تو تقریباً دن کے دو بج رہے تھے۔ ہماری اگلی منزل میمفس تھا۔ میمفس فرعونِ مصر رعمسیس کا پایہء تخت تھا۔

میمفس میں رعمسیس دوم کا مجسمہ

میمفس میں رعمسیس دوم کا مجسمہ شیر کے دھڑ کے ساتھ

میمفس میں رعمسیس دوم کے ایک مجسمے کے پاس لگی تختی

میمفس ہی میں رعمسیس کے دور کا ایک پتھر جس پر
اُس کے دور کی تحریر درج ہے

میمفس میں رعمسیس دوم کا ایک مجسمہ جس میں ایک اور مجسمہ
تراشا گیا ہے۔

میمفس میں رعمسیس کے پارک میں بیٹھا سیاہ اور فاختئی رنگ کا کوا

میمفس میوزیم میں رعمسیس کا اپنا بنوایا ہوا اپنا مجسمہ

کمال کا خیال تھا کہ ہمیں میمفس جانے سے پہلے لنچ کر لینا چاہئے۔ خیال اِتنا بُرا نہیں تھا۔ ویسے بھی گزشتہ دو دن کی دوڑ دھوپ سے میں ابھی تک مکمل طور پر ریکور نہیں کر پایا تھا۔

اِس لئے ہم میمفس جاتے ہوئے راستے میں ایک ریستوران پر رُکے۔ ریستوران کا نام مطعم المصر تھا۔

مطعم المصر میں بفے اسٹائل لنچ چل رہا تھا۔ بفے میں مشکل سے دس بارہ آئٹم ہوں گے۔ میں کوئی زیادہ ثقیل خوراک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے ایک رکابی میں سوپ ڈالا اور ایک ٹیبل پر جا کر بیٹھ گیا۔

کمال اور ابراہیم نے اپنی اپنی پلیٹوں میں پسند کی خوراک ڈالی اور ایک الگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ شاید وہ پروفیشنلزم قائم رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے اپنی رکابی اُٹھائی اور اُن کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑا سے جھینپے لیکن پھر اُنہوں نے مجھے اپنی ٹیبل پر خوش آمدید کہا۔

ہم نے آدھ گھنٹے کے قریب مطعم المصر میں صرف کیا اور پھر میمفس کے طرف روانہ ہو گئے۔ کوئی دس کلو میٹر کے قریب گاڑی چلانے کے بعد ہم ساڑھے تین بجے کے قریب میمفس کی حدود میں داخل ہوئے۔ میمفس کے مقام پر اِس وقت کوئی شہر آباد نہیں۔ کیا کسی زمانے میں یہاں کوئی شہر آباد تھا۔ اگر تھا تو اب اِس کے یہاں کوئی آثار نہیں تھے۔ لیکن تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ میمفس رعمسیس دوم کا پایہء تخت تھا۔

رعمسیس مصر کا طاقت ور ترین فرعون سمجھا جاتا ہے جو بیس سال کی عمر کے قریب مصر کا حکمران بنا۔ اُس نے مصر پر بلا شرکتِ غیرے ٦٧ سال تک حکومت کی۔ وہ ٩٠ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

رعمسیس نے اپنے ۶۷ سالہ دور حکومت میں کئی جنگیں لڑیں۔ بہت سا علاقہ مصر میں شامل کیا۔ کہتے موجودہ نہر سویز کا آئیڈیا بھی رعمسیس کا تھا اور اس کی کھدائی بھی سب سے پہلے اُسی کے زمانے میں ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً ہر دور میں خطے کے حکمرانوں کی دل چسپی اس میں قائم رہی۔

حضرت عمر بن العاص کا لشکر جب مصر پر قابض ہوا تو انہوں نے بھی اِس کی افادیت کی وجہ سے نہر سویز پر خاص توجہ دی۔

رعمسس کو تعمیر و ترقی کے منصوبوں سے خاص دل چسپی تھی۔ وہ ملٹری امور کا بھی ماہر تھا۔ اپنی ہمعصر علاقائی ریاستوں سے جنگوں اور پھر معاہدوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسٹیٹ کرافٹ پر بھی اُس کو مکمل دسترس حاصل تھی۔

مصری علوم کے ماہرین کا خیال ہے کہ رعمسیس دوم ہی وہ فرعون ہے جس کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سامنا کرنا پڑا۔ لیکن رعمسیس دوم کی ساری زندگی کے حالات تقریباً تاریخی ریکارڈ کا حصہ ہیں۔

اس تاریخی ریکارڈ کے مطابق مصر میں رعمسیس دوم کی بطورِ خدا پرستش کی جاتی تھی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اُس کی جدوجہد کا کوئی ذکر نہیں۔ یہودی اسکالروں کی شماریات کے مطابق بھی رعمسیس دوم کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ نہیں بنتا۔ یہودی اسکالروں نے یہ اعداد و شمار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں انجیل میں بیان کردہ بعض اہم واقعات کے تاریخی شواہد کے زمانی عدم تطابق اور تطابق کی بنیاد پر قائم کئے ہیں۔

چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعونِ مصر کی کشمکش میری اس تحریر کا موضوع نہیں اِس لئے میری درخواست ہے کہ جو صاحبان اس موضوع سے دل چسپی رکھتے ہیں اُنہیں دوسرے علمی ذرائع سے اپنی تشفی کرنا چاہیئے۔

میمفس میں ایک چھوٹا سا پارک بنایا گیا ہے جہاں رعمسیس دوم کے کئی مجسمے موجود ہیں۔ وہیں ایک چھوٹے سے میوزیم میں رعمسیس دوم کا ایک مجسمہ رکھا گیا ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں یہ اُس نے خود اپنی زندگی میں بنوایا تھا۔ یہ خاصی حد تک ٹھیک حالت میں ہے۔

رعمسیس دوم کی قاہرہ میوزیم میں رکھی گئی ممی

صرف بایاں ہاتھ معمولی طور پر ٹوٹا ہوا ہے جسے بحال کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ مصر میں اب بھی رعمسیس دوم کے اثر کے شواہد دیکھے جاسکتے ہیں۔ اب بھی ہمیں قاہرہ، اسکندریہ، لکسر اور دیگر شہروں میں اُس کے نام پر شاہراہوں، کافی ہاؤسوں اور دیگر کاروباروں کے نام دکھائی دیتے ہیں۔

اِس پارک میں رعمسیس سے متعلقہ نوادرات دیکھتے ہوئے دو کوے دکھائی دیئے۔ اب تک ہم یہ سمجھتے تھے کہ کوے کالے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں دو رنگے کوّے تھے۔ اِن کے صرف پر کالے تھے لیکن پروں کے درمیان سارے کا سار دھڑ اوپر نیچے گہرے فاختائی رنگ کا تھا۔ تاہم اِن کا قد کاٹھ پاکستانی کوّں جتنا ہی تھا۔

میمفس سے فارغ ہوئے تو کمال نے کہا کہ ہمارے معاہدے کے مطابق یہ آخری سائٹ تھی جو ہمیں آپ کو دکھانا تھی۔

اب ہم واپسی کے لئے تیار ہے۔ تب تک سورج بھی تیزی کے ساتھ اپنے مغربی مستقر میں داخل ہو رہا تھا۔

ہم نے میمفس سے قاہرہ کی طرف واپس سفر شروع کیا۔ میمفس سے قاہرہ کی طرف ہم نے چند میل سفر کیا تو مجھے سڑک پر انٹرنیشنل کارپٹ اسکول کی عمارت دکھائی دی۔ میں نے کمال سے پوچھا کہ یہ انٹرنیشنل کارپٹ اسکول کیا ہے۔ اُس نے کہا یہاں پر بچوں کو کارپٹ بنانا سکھایا جاتا ہے۔

میں نے کمال سے اسکول دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اُس نے ابراہیم کو گاڑی انٹرنیشنل کارپٹ اسکول کی طرف لے جانے کے لئے کہا۔

ابراہیم گاڑی موڑ کر کارپٹ اسکول کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ہم اسکول کے اندر گئے تو میں نے دیکھا بہت سی بارہ بارہ تیرہ تیرہ سال کی بچیاں بڑی تیزی اور جا بکدستی کے ساتھ کارپٹ بُن رہی تھیں۔

انٹر نیشنل کارپٹ اسکول میں کام کرتی بچیاں

انٹرنیشنل اسکول میں بنے ہوئے چند کارپٹوں کے نمونے

بچیوں کو کارپٹ بنتے دیکھ کر مجھے پاکستان میں کام کرنے والے بچے یاد آئے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بے حسی دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ اِن بچیوں کو اسکول میں ہونا چاہئے تھا وہ تعلیم کے نام پر کارپٹ بنانا سیکھ رہی تھیں۔

میں نے وہاں کام کرنے والے استاد سے پوچھا کہ وہ بچیاں اسکول کیوں نہیں جاتیں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ مصر میں اسکول کا دن چار گھنٹے ہوتا ہے۔ سب تعلیمی اداروں میں دن میں چار چار گھنٹوں کی دو شفٹیں ہوتی ہیں۔ یہ بچیاں اپنا اسکول اٹینڈ کرنے کے بعد چار گھنٹے کے لئے یہاں آ کر کارپٹ بنانا سیکھتی ہیں۔

میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ اُنہیں یہاں نہ صرف کام سکھایا جاتا ہے بلکہ اُن کے کام کی اُجرت دی جاتی ہے۔

مجھے اُس سے یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ اُنہیں اِس کام کی کتنی اُجرت ملتی ہے۔ میں پاکستان میں اِس حوالے سے چائلڈ لیبر کی صورتِ حال سے آگاہ تھا۔ مصر اگر دیگر معاملات میں پاکستان جیسا تھا تو چائلڈ لیبر میں کیسے مختلف ہو سکتا تھا۔

میرے چہرے پر افکار کے تیرتے بادل دیکھ کر اُس نے مجھے بچّوں کے بنائے ہوئے کارپٹ دیکھنے کی دعوت دی۔

کارپٹ واقعی قابلِ دید تھے۔ لیکن اُن کی خوبصورتی میرے دل کے بوجھ کو کم نہ کر سکی۔ میں نے کمال سے واپس ہوٹل چلنے کے لئے کہا۔

اِس طرح میں نے مغرب میں تیزی سے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں میں قاہرہ میں اپنے پہلا دن ختم کیا۔

میں نے ایک دن میں تاریخ کا ساڑھے چار ہزار سال کا سفر طے کیا۔ مجھے ایک طرف فراعینِ مصر کے پیرامڈز بناتے ہوئے برہنہ بدن غلام دکھائی دیئے تو دوسری طرف کھڈیوں پر کارپٹ بنانے والی معصوم بچیوں کی تیزی سے چلتی اُنگلیاں۔ کبھی گرم ریت پر پتھروں کو کھینچتے غلام معصوم بچیوں کی کھڈیوں پر چلتی انگلیاں بن جاتے اور کبھی بچیوں کی اُنگلیاں اُن غلاموں میں تبدیل ہو جاتیں۔

یہاں تک کہ میرے لئے اُن دونوں کا فرق معدوم ہو گیا۔ ابراہیم نے گاڑی ہوٹل کے دروازے کے سامنے روکی۔ میں نے ابراہیم اور کمال کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے دیکھا غلاموں اور بچیوں کی انگلیوں کے پیچھے دو کوے اُڑ رہے تھے جن کے پروں کے رنگ سیاہ لیکن باقی جسم گہرے فاختائی تھے۔

قاہرہ میں دوسرا دن

قاہرہ میں دوسرے دن سو کر اٹھا تو دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ اگرچہ میں ہوٹل کی نویں منزل پر قیام پذیر تھا لیکن ارد گرد کی عمارتوں نے سارا ویو بلاک کر رکھا تھا۔ اس لئے کھڑکی سے باہر دور تک دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ چناچہ کھڑکی کے منظر سے لطف اندوز ہوئے بغیر میں نے جلدی سے غسل کیا، کپڑے تبدیل کئے، ہوٹل کے سیکنڈ فلور پر واقع ریستوران میں فری ناشتہ کیا اور ہوٹل سے باہر نکل کھڑا ہوا۔

بہت دیر تک یونہی سڑکوں پر آوارگی کرتا رہا۔ جب آوارگی سے تھوڑی تھکن ہونے لگی تو میں نے پاس سے گزرتی ایک سفید اور سیاہ رنگ کی ٹیکسی کو روکا۔ قاہرہ کے ٹرانسپورٹیشن سسٹم میں دو چیزوں کا بہت ہاتھ ہے۔ ایک انڈر گراونڈ میٹرو کا اور دوسرا ان سفید اور سیاہ رنگ والی ٹکسیوں کا۔ قاہرہ شہر کی آبادی اٹھارہ ملین کے قریب ہے۔ کوئی دو ملین لوگ روزانہ باہر سے قاہرہ میں کام کرنے کے لئے آتے ہیں۔ خالی میٹرو سے چھ ملین لوگ روزانہ سفر کرتے ہیں۔ باقی سارا بوجھ یہی سفید اور کالے دھبوں والی ٹیکسیاں برداشت کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ بسوں اور ویگنوں کا بھی ایک نظام موجود ہے لیکن یہ ٹیکسیاں آپ کو قاہرہ میں کہیں بھی دو تین ڈالر میں لے جائیں گی۔ دو تین ڈالر کا مطلب ہے دس یا بیس مصری پاونڈ جنہیں اہل مصر گنی کہتے ہیں۔ آپ آنکھیں بند کر کے ان میں بیٹھ جائیں سفر کے اختتام پر آپ کو یہ اندازہ نہیں ہو گا کہ آپ ٹیکسی والے کے ہاتھوں لُٹ گئے ہیں۔ تاہم اس بات کا خیال رہے کہ وہ چلتے وقت ٹیکسی کا میٹر آن کر لیں ورنہ وہ آپ سے کسی رقم کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں۔

ائیرپورٹ پر بھی جب آپ کسی بیرونی ملک سے قاہرہ آئیں تو یہ اصول لاگو نہیں ہوتا وہاں ٹیکسیوں والے آپ سے سودے بازی کرتے ہیں اور عام طور پر میٹر سے تین چار گنا زیادہ پیسے مانگتے ہیں۔ وہاں آپ کے پاس آپشنز کم ہوتے ہیں چناچہ آپ کو اصل کرائے سے زیادہ کرایہ ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔

بہر حال میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر ٹیکسی ڈرائیور سے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کی تو پتہ چلا وہ انگریزی میں بالکل نابلد ہے۔ لہذا اُسے ٹوٹی پھوٹی عربی میں جامع ازہر چلنے کے لئے کہا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں قاہرہ آؤں اور دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی کے درشن کئے بغیر چلا جاؤں۔

وہ کافی دیر تک قاہرہ کی سڑکوں پر گاڑی دوڑانے کے بعد آخر نصریہ میں مجھے گرد سے اٹی ہوئی ایک زرد سی عمارت کے سامنے لے آیا۔ عمارت کی حالت دیکھ کر پہلے تو یقین نہ آیا کہ یہ جامع ازہر ہے پھر دل کو جھٹکا لگا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آخر آنسو کیوں نہ آتے، الازہر عالمِ اسلام بلکہ دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے جس کا 970 سن عیسوی میں اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کے لئے ایک مدرسے کے طور پر قیام عمل میں لایا گیا تھا۔

کہتے ہیں الازہر کو اپنے دورِ حکومت میں فاطمیوں نے قائم کیا تھا۔ اُنہوں نے اِس کا نام حضورِ اکرم کی بیٹی فاطمہ الزہرہ کے نام پر الازہر رکھا تھا۔

اپنے قیام سے لیکر الازہر ہمیشہ قرانی علوم، عربی گریمر، اسلامی فلسفے، اسلامی فلکیات اور اسلامی منطق کی تعلیم کے سنٹر کی طور پر پوری اسلامی دنیا میں جانی جاتی رہی ہے۔

مختلف اَدوار کے دوران اِس کی تعلیمی سرگرمیوں میں التواواقع ہوتا رہا لیکن اِسے مکمل طور پر کبھی بند نہیں کیا گیا۔

بیسویں صدی کے دوران اِس میں بعض جدید علوم جیسے شعبہءانجنیرنگ اور میڈیسن شامل کئے گئے۔ لیکن اسلامی اور باقی دنیا میں اِس کی شہرت اِس کی مذہبی تعلیم کی وجہ سے رہی۔ خصوصی طور پر اسلامی دنیا میں مختلف مسائل پر الازہر یونیورسٹی کی آراء کو شرفِ قبولیت بخشا جاتا اور اِستحسان کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

لیکن بدقسمتی سے ایک علمی ادارہ ہونے کی حیثیت سے اَلازہر کو علمی ارتقا میں جو کردار ادا کرنا چاہئے تھا اپنی قدامت پسندانہ روش کی وجہ سے یہ ایسا کرنے میں ناکام رہی۔

اِس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسلام میں علمی ارتقا کا تصور خاصہ مخدوش ہے۔ مسلمان مفکرین کا الہاتی اور اسلامی علوم کی ابدیت کا اصول علمی ارتقا کے تصور سے متصادم ہے۔ یہی وہ علمی تصادم ہے جہاں اَلازہر جیسی یونیورسٹی اہم کردار ادا کر سکتی تھی لیکن یہ الہاتی فلسفے سے وابستہ ادارہ ہونے کی وجہ سے ایسا نہ کر سکی۔

ہم مسلمان بھی کیسے سادہ لوگ ہیں۔ اپنے ان خزانوں سے استفادہ کرنا نہیں جانتے جن سے ہماری حیات کے چشمے پھوٹتے ہیں یا پھوٹ سکتے ہیں۔

جامع اَلازہر آنے سے پہلے میں یہ سوچ رہا تھا کہ جامع اَلازہر ایک جدید یونیورسٹی ہوگی جس میں قدیم کے ساتھ جدید ترین علوم کی تعلیم بھی دی جاتی ہوگی قران وحدیث کے ساتھ سائنس اور میڈیسن میں جدید ترین ترقیوں سے طلبہ کے اذہان کو منور کیا جاتا ہوگا۔ لیکن یہاں تو کچھ تھا ہی نہیں۔ عمارت کو دیکھ کر لگتا تھا کہ الازہر کو تو خود میڈیسن کی ضرورت تھی۔ یونیورسٹی کی ظاہری حالت دیکھ کر مجھ پر کافی دیر بے یقینی کی کیفیت طاری رہی کہ کیا یہی جامع الازہر ہے۔

بے یقینی کی اس حالت میں میں نے آنکھیں ملتے ہوے دروازے پر لگے دھندلائے ہوئے پتھر پر کلمات پڑھے تو جلی حروف میں جامع اُلازہر ہی لکھا ہوا تھا۔
سیاحوں کے اور بھی کئی گروپ یونیورسٹی کی زیارت کے لئے تشریف فرما تھے۔ گیٹ کے اندر داخل ہوا تو دونوں طرف ایک ایک کفش بردار لوگوں کے جوتے سنبھال رہا تھا۔
ایک ورانڈے سے آگے جامع کا بہت بڑا صحن تھا جس کے چاروں طرف ورانڈے بنے تھے اور ورانڈوں کے اندر کمرے بنے ہوئے تھے۔ ورانڈوں میں بہت سے مدقوق الحال لوگ

جامع اظہر کا اندرونی منظر

جامع اظہر کے دائیں جانب کا ورانڈا اور ورانڈے کے اندر بنے چھوٹے ہال

جامع الازہر کا ایک اور اندرونی منظر

جامع الازہر کے دروازے کا کتبہ

دریوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ دیکھنے میں کسی طور پر طالب علم نہیں لگتے تھے۔ لگتا تھا بے گھر لوگ ہیں جو آرام کرنے کے لئے وہاں چلے آئے تھے۔

میں حواس باختہ دُکھ اور غم کی کیفیت میں دائیں ہاتھ والے ورانڈے کے اندر کمروں کو دیکھتا سامنے والے ورانڈے میں پہنچا وہاں تھائی لینڈ کی ایک لڑکی اور لڑکا الازہر کے احاطے میں اپنی تصویریں بنا رہے تھے۔ میں نے اپنا کیمرہ اُن کے طرف بڑھاتے ہوئے اُن سے درخواست کی کہ وہ میری بھی ایک دو تصویریں بنادیں۔ جو اُنہوں نے کمالِ مہربانی سے کام لیتے ہوئے بنادیں۔ سامنے والے ورانڈے کی پچھلی دیوار کے ساتھ قدِ آدم سے کافی بلند مہاگنی لکڑی کی ایک فینس کھڑی تھی۔ اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ فینس کے اندر جھانکنے کی کوشش کی تو مسجد کے ہالوں کی طرح ایک بہت بڑا ہال دکھائی دیا۔ ہال کے اندر کوئی نہیں تھا۔

میں نے بددل ہو کر عمارت کے اندرونی حصے کی چند ایک اور تصویریں بنائی اور باہر نکل آیا۔ کفش بردار سے اپنے جوتے لئے۔ اُس کو نذرانہ دینے کے لئے پرس کھولا تو چھوٹے سے چھوٹا نوٹ ۲۰ مصری پاؤنڈ کا تھا۔ میں نے اُسے بخشیش میں وہی تھما دیا۔ اُس نے چند لمحوں کے لئے نوٹ کو عجیب نظروں سے دیکھا اور پھر سامنے رکھے ایک دراز میں ڈال لیا۔ میں کفش بردار سے جوتے لے کر چپکے سے جامع االازہر سے باہر نکل آیا۔

یونیورسٹی کی موجودہ صورتِ حال کے باوجود بعض بہت نامور شخصیات نے جامع الازہر سے فائدہ اُٹھایا۔ ان نامور شخصیات میں سے نمایاں ترین شخصیت سعید ذغلول کی ہے۔ سعید ذغلول نے بیسیویں صدی کے آغاز میں، 1919 کے انقلاب میں، اہلِ مصر کی برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایک اور نامور شخصیت جو جامع الازہر سے وابستہ

رہی وہ جمال الدین افغانی کی تھی۔ جمال الدین افغانی نے انگریزی دور میں اسلامی ممالک میں
احیائے اسلام کی تحریکوں میں بہت فعال کردار ادا کیا۔

مصنف اسکندریہ میں نصب سعید ذغلول کے مجسمے کے سامنے

بہر حال میں یونیورسٹی سے باہر آیا تو سامنے کھڑی ایک اور سفید اور کالے رنگ کی ٹیکسی میں بیٹھ کر اُسے واپس سفیر ہوٹل چلنے کے لئے کہا۔

واپس آتے ہوئے ٹیکسی محمد علی کے قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا وہ مجھے قلعے کے داخلے والے حصے کی طرف لے چلے۔ قلعے کے سامنے گزنے والی سڑک پر قلعے کے مین گیٹ سے کافی ہٹ کر دونوں طرف پولیس چوکیاں تھیں۔ پہلے ہم ایک چوکی پر گئے تو وہاں کھڑے پولیس والوں نے کہا دوسری طرف جاؤ۔ دوسری طرف گئے تو ڈیوٹی پر کھڑے پولیس والوں نے کہا کہ آج قلعہ میں سیاحت کے لئے داخلہ بند ہے۔ قلعہ بند ہونے کی اطلاع کے باوجود میں نے دیکھا کچھ لوگ مسلسل قلعے میں آجا رہے تھے۔ میں نے ہلکے سے احتجاجی انداز میں پولیس کے انچارج سے کہا کہ اور لوگ تو قلعے میں آجا رہے ہیں۔ اُس نے کہا وہ قلعے میں کام کرنے والے لوگ ہیں۔ خیر میں نے دُور سے محمد علی کے قلعے کی چند تصویریں بنائیں اور وہاں سے چل پڑا۔ کیونکہ پاکستانی پولیس کی طرح مصری پولیس کی شہرت بھی کچھ اچھی نہیں۔ اِس کے علاوہ خاص طور پر غیر ملکی ہونے کی وجہ سے پرائے ملک میں غیر ضروری بہادری سے گریز کرنا ہی مناسب تھا۔

اب تک ملنے والے دوسرے ٹیکسی والوں کی طرح یہ ٹیکسی والا بھی انگریزی سے مکمل طور پر نا آشنا تھا۔ بہر حال گزارا کرنا تھا۔ ٹیکسی والا میرے ہوٹل کی طرف گاڑی چلا رہا تھا۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا ٹیکسی دریائے نیل کے پل پر پہنچ گئی ہے۔ میں نے جیب سے بیس پاؤنڈ نکال کر ٹیکسی کے ڈرائیور کو دیئے اور اُس سے درخواست کی کہ وہ مجھے وہیں دریائے نیل کے پل پر اُتار دے۔ میری درخواست کی تعمیل کرتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے نیل کے پل پر اُتار دیا۔

وہاں پل پر بیٹھا ایک بوڑھا مصری ایک گاہک کے جوتے پالش کر رہا تھا۔ بوڑھے مصری کی حالت دیکھ کر مجھے بہت دُکھ ہوا۔ ہمارے ملکوں میں بڑے بوڑھے بھی کتنے مجبور ہوتے ہیں۔ عمر کے جس حصے میں اُنہیں آرام اور آسائش کی ضرورت ہوتی ہے وہ کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اُس کی ظاہری حالت اور شکل و صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت مجبوری کی حالت میں یہ کام کر رہا ہے۔ میرا جی چاہا میں اُس کی مدد کروں۔ لیکن میں ہزاروں میل دور سے آیا ایک مسافر اُس کے لئے کیا کر سکتا تھا۔

میں نے اُسے پوچھا کہ وہ جوتے پالش کرنے کے کتنے پیسے لیتا ہے۔ اُس نے کہا آدھ گنی۔ میں نے اپنے جوتے اُتار کر اُسے دیئے۔

اُس نے جوتے پالش کر کے میرے حوالے کئے تو میں نے اُسے سو پاؤنڈ کا نوٹ دیا۔ اُس نے کہا اُس کے پاس چھٹا نہیں ہے۔ اُس نے مجھے سو پاؤنڈ واپس دینے چاہے۔ مجھے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ اگر چھُٹا نہیں تو ٹھیک ہے۔

اُس کا جواب سن کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ غریب لوگوں کا دل کتنا بڑا ہوتا ہے۔ میں بھی اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ میں سو پاؤنڈ اُس کے پاس چھوڑ کر آگے چل پڑا۔ سو پاؤنڈ۔۔۔ سترہ امریکی ڈالر۔۔۔ کتنے دن اُس کے کام آسکتے تھے۔ وہ سکتے کی حالت میں مجھے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نے پل پر کھڑے ہو کر دریائے نیل کے اِرد گرد کے علاقوں کی بہت سی تصویریں بنائیں۔ میں چاہتا تھا دریائے نیل کے اُس سین کو اپنے کیمرے میں محفوظ کر لوں۔

پل پر اسی طرح چہل قدمی کرتا اور ارد گرد کے علاقے اور دریائے نیل کی تصویریں بناتا میں پل سے نیچے اترا تو میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا جہاز وہاں آکر کنارے لگا۔

جہاز میں سے کئی مسافر اُترے اور کئی نئے مسافر سوار ہوئے۔ میں نے جہاز کے عملے میں سے ایک سے پوچھا کہ جہاز کہاں جارہا ہے۔

اُس نے بتایا کہ جہاز تحریر اسکوائر جارہا ہے۔ تحریر اسکوائر اور قاہرہ میوزیم دونوں میری سیاحت کی لسٹ پر تھے۔ میں نے اس سے کرایہ پوچھا اُس نے کہا ایک گنی۔ میں نے اُسے بیس پاؤنڈ کا نوٹ دیا۔ اُس نے اُنیس گنی اور ٹکٹ مجھے تھماتے ہوئے جہاز پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔

میں جہاز پر سوار ہوا تو جہاز آہستہ آہستہ کنارے سے ہٹ کر تحریر اسکوائر کی طرف چل پڑا۔ میں جہاز کے عرشے پر کھڑا دریائے نیل اور دریا کے ارد گرد کے علاقے کی تصویریں بناتا رہا۔ شہر کے بیچوں بیچ گزرنے کے باوجود دریا کے پانی کا رنگ گہرا نیلا اور صاف شفاف تھا۔ لگتا تھا کہ اہلِ قاہرہ پانی کی شفافیت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مجھے پھر ایک بار پاکستان کے دریا یاد آئے۔ جنہیں ہم نے اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے بدرووں میں تبدیل کر دیا ہے۔

دریائے نیل کے کنارے بنی عمارات

دریائے نیل کا ایک اور سین

مجھے لگا دریائے نیل ایک روحانی دیوتا کی طرح جہاز کو اپنی گود میں منزلِ مقصود کی طرف لے جا رہا ہے۔

ایسے میں مجھے قاہرہ والوں پر بہت رشک آیا۔ کتنے خوش نصیب ہیں قاہرہ کے یہ باسی کس طرح دریا انہیں لاکھوں کروڑوں سال سے اِسی طرح نسل در نسل اپنی گود میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جاتا ہے۔

مجھے وہ خوبصورت نوجون مصری خاتون یاد آئی جس نے کل ہی مجھے پیپر کمپنی میں میں مصریوں کے چار ہزار سال پرانے نیل کی وادی میں اگنے والے پاپیرس کے پودے سے پیپر بنانے کے طریقے سے پیپر بنا کر دکھاتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی پاپیرس سے ٹوکری بنانے کی کہانی سنائی تھی۔ پھر اس نے مجھے پاپیرس کے تازہ پودے کا پتلا سا چھلکا اتار کر دیتے ہوئے کہا اپنے پورے مسّل استعمال کر کے اس توڑ کر دکھاؤ۔ میں پوری قوت استعمال کرنے کے باوجود پاپیرس کے چھلکے کو توڑنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ چھلکا ہمارے سروٹ سے جس سے ہم ٹوکریاں بناتے ہیں زیادہ مضبوط تھا۔

پھر اُسی خوبصورت نیک دل خاتون نے مجھے تصویر میں بنے چودہ ججوں والی وہ کہانی سنائی جو میں نے پیرامڈز والے حصے میں لکھی تھی۔

نہ جانے کیوں نیل کے پانی میں تیرتے جہاز کے عرشے پر کھڑے اُس خوبصورت آنکھوں اور شیریں لہجے والی مصری خاتون کا خیال آتے ہی میرے اندر کا شاعر جاگ اُٹھا اور میری زبان پر بے اختیار مندرجہ ذیل شعر آتے چلے گئے:

اے سفیرِ آسماں اے آبِ نیل
تجھ سے تازہ مصر کے سارے نخیل

تیرے دم سے مصر کی ہیں رونقیں
مصر والوں کا ہے تو واحد کفیل
دُختران ِمصر کی آنکھیں حسین
دُخترانِ مصر کے چہرے جمیل
مصر کے بیٹوں کے چہرے تابناک
تیرے دم سے مصر کے بیٹے شکیل
نیل کی بیٹی کا مفتوح فاتح روم
جس کے خوشہ چین تھے دینوب و نیل
تیرے فرعوں آسمانوں کے حریف
تیرا موسیٰ راہِ حق کی ہے دلیل
غُلغلہ تیرا ہے زیرِ آسماں
موجزن ہے تا ابد تیری سبیل

ابھی میری نظم ختم نہیں ہوئی تھی کہ جہاز تحریر اسکوائر کے پاس کنارے آ لگا۔ تحریر اسکوائر ہی جہاز میں بیٹھے سب مسافروں کی منزل تھا۔

میں نے وہیں جہاز کے عرشے پر کھڑے اپنی جیبیں ٹٹولیں تا کہ کاغذ کے کسی ٹکڑے پر نظم لکھ لوں۔ لیکن بد قسمتی سے اُس وقت میرے پاس کاغذ کا کوئی ٹکڑا نہیں تھا۔ میں نے اپنے سیل فون کا نوٹ پیڈ کھول کر رومن اردو میں یہ غزل نما نظم نوٹ کی۔

پھر میں بھی باقی مسافروں کے ساتھ جہاز سے نیچے اتر آیا۔ جہاز سے باہر آیا تو ایک نوجوان مصری لڑکا وہاں چھوٹا سا اسٹال لگائے چائے بیچ رہا تھا۔

چولہے پر پانی پہلے سے اُبل رہا تھا۔ مجھ سے چائے کا ایک گنی وصول کر اُس نے ایک کپ میں تھوڑی سی پسی ہوئی چائے اور چینی ڈال کر اُبلتا ہوا پانی کپ میں ڈال دیا۔

چائے بنانے کا یہ طریقہ میں نے زندگی میں پہلے بھی کئی بار دیکھا ہے۔ میں خود بھی اپنی چائے اکثر اسی طرح بناتا ہوں لیکن مصریوں کی چائے جیسی لذت کہیں اور نہیں ملتی۔

مصریوں کی چائے کا میں پہلے بھی مداح رہا ہوں۔ ایک بار چند دوستوں کے ہمراہ اٹلی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

اٹلی کی سیاحت کے دوران کئی دن ہم نے میلان میں گزارے تھے۔ میلان میں ہمارے ہوٹل سے کچھ دور ایک مصری کی چھوٹی سی شوارما شاپ تھی۔

ایک دن ہم شوارما کھانے کے لئے وہاں رُکے۔ ہمیں اُس مصری کا شوارما بالکل پسند نہ آیا۔ شوارمے کے بعد ہم نے چائے پی۔ چائے اتنی مزیدار تھی کہ اُس کے بعد ہم جتنے دن میلان میں رہے روزانہ شام کا کھانا اِدھر اُدھر کھانے کے بعد چائے پینے کے لئے اُس مصری کی شوارما شاپ پر جاتے رہے۔

بہر حال نیل کے کنارے واقع اُس خوانچہ فروش سے چائے پی کر میں تحریر اسکوائر کی طرف چل پڑا۔ چند بلاک چل کر تحریر اسکوائر پہنچا تو وہاں مصری پولیس نے چاروں طرف فینس لگا کر اسکوائر کو بند کر دیا تھا۔

مجھے اسکوائر کے گرداگرد اس طرح فینس دیکھ کر دُکھ ہوا۔ میں سوچنے لگا یہ وردی والے، جہاں کے بھی ہوں، کتنے پاگل ہوتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ انسانوں کے خوابوں کو ایسی دیواریں کھڑی کر کے یا گولیاں چلا کر نہیں روکا جاسکتا۔

مصریوں نے تحریر اسکوائر پر اپنی عظیم الشان قربانی سے انسانی آزادیوں کی جس تحریک میں ایک سنگ میل نصب کیا تھا اِس پر مصریوں کو فخر ہونا چاہئے تھا۔ اظہار تفاخر کے طور پر وہاں

ایک مینار کھڑا کرنا چاہیئے تھا۔ اس طرح اپنی جد و جہد کی نشانیوں کو اپنی عظیم الشان تاریخ کا حصہ بنانا چاہیئے تھا۔

یہی سوچتے میں نے تحریر اسکوائر پر کھڑے کھڑے پاس ہی واقع مصر میوزیم کی ٹکٹوں کی کھڑکی سے ساٹھ مصری پاؤنڈ کا ایک ٹکٹ خریدا اور اسکوائر کے سامنے کھڑی مصر میوزیم کی زعفرانی عمارت میں داخل ہو گیا۔

میوزیم کے چیکنگ پوائنٹ پر جا کر مجھے پتہ چلا کہ میوزیم میں کیمرہ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ابھی میں گومگو میں تھا کہ کیمرے کا کیا کروں کہ سیکورٹی والوں نے رسید دے کر کیمرہ اپنے پاس رکھ لیا اور یہ کہہ کر مجھے اندر جانے دیا کہ میں واپسی پر رسید دے کر یہ کیمرہ اُن سے لے سکتا ہوں۔

تحریر اسکوائر کے سامنے واقع مصر میوزیم کا سامنے کا دروازہ

میوزیم کے عقبی حصے کا ایک منظر

میوزیم میں داخل ہوتے ہی دونوں طرف رعمسیس دوم کے مجسمے کھڑے تھے۔ اپنے اِس مختصر دورے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ مصری فراعنہ مصر کے بارے میں بہت پراوڈ ہیں۔
مجھے سارے مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نام کی کوئی تختی یا کوئی بورڈ کہیں دکھائی نہ دیا لیکن رعمسیس کے نام کے بورڈ سرراہ چلتے کہیں نہ کہیں دکھائی دیتے رہے۔
کوئی مصری اپنے بچے کا نام رعمسیس نہیں رکھتا لیکن کاروباری مقصد کے لئے رعمسیس کے نام کا اتنا استعمال سمجھ سے بالاتر ہے۔
میں نے میوزیم کے داخلی دروازے کے اندر کھڑے فرعونِ مصر رعمسیس کے مجسمے کو ہاتھ باندھ کر سلام پیش کیا اور میوزیم کے ہال میں آگے بڑھ گیا۔
سچ بات یہ ہے کہ مجھے قاہرہ کا میوزیم دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ سوائے ممیوں کے وہاں کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ پرانے زمانے کے زیورات تھے جو مصری اشرافیہ کی خواتین استعمال کرتی تھیں یا اُن کے زیر استعمال رہنے والے مٹی کے برتن یا پتھروں کے وہ کتبے جو کھدائی سے ملے تھے۔
ممیوں کی گنتی کے لئے صرف نمبر استعمال کئے گئے تھے لیکن کسی ممی کے ساتھ کوئی تفصیل نہیں تھی جس سے پتہ چلتا کہ یہ کس کی ممی تھی۔ ظاہر ہے اِس کام کے لئے جس جانفشانی اور ریسرچ کی ضرورت تھی وہ نہیں کی گئی تھی۔ بس جو چیز جہاں سے ملی اُسے لاکر میوزیم میں رکھ دیا گیا۔
ہاں ایک چیز جو مجھے پسند آئی وہ جواں نسل کے وہ مصری آرٹسٹ تھے جو میوزیم میں جگہ جگہ بیٹھے مختلف نوادرات کی رنگوں کی مدد سے ٹروکاپیاں بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔
اُن کے انہماک اور جانفشانی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مصر کی نوجوان نسل کو اپنے ثقافتی ورثے کے تحفظ کا کہیں زیادہ احساس ہے۔

میں جب اسرائیل گیا تھا تو یروشلم کے میوزیم میں میں نے چار گھنٹے گزارے تھے اور پھر بھی وقت کی تنگ دامانی کا احساس تھا۔ وہاں اتنا کچھ دیکھنے کو باقی تھا کہ اور کئی گھنٹے وہاں گزر سکتے تھے۔

لیکن مصری میوزیم سے میں ایک گھنٹے میں باہر آ گیا اور دوبارہ وہاں جانے کی کوئی خواہش نہیں۔

میں میوزیم سے نکلا تو قاہرہ پر شام کے سائے آہستہ آہستہ پھیلتے جا رہے تھے۔ اسٹریٹ لائٹس روشن ہو چکی تھیں۔ پھر بھی میں بے مقصد التحریر اسکوائر پر گھومتا رہا۔ کاروباری لوگ اب بھی اپنی دوکانوں پر بیٹھے آنے والوں گاہکوں کو اپنا سامان بیچنے کے لئے اُن سے مول تول کر رہے تھے۔ بالکل پاکستانیوں کی طرح۔

جہاز میں ملنے والے مصری امریکن کے بقول مصری تاجر ہر چیز کی قیمت چار گنا بڑھا کر بتاتے ہیں۔ اگر سو پاؤنڈ مانگیں تو ۲۵ پاؤنڈ آفر کریں تو بیچ میں کہیں سودا ہو جائے گا۔

التحریر اسکوائر میں اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد میں نے سفید اور کالے رنگ کی ٹیکسی پکڑی اور ہوٹل واپس چلا آیا۔ ہوٹل کی لابی میں کسی مصری نوجوان جوڑے کی شادی کی ریسپشن چل رہی تھی۔ تیز میوزک اور اپنے عزیز و اقارب کے ہمراہ دلہا اور دلہن ہوٹل میں اپنے بک کئے ہال کی طرف چل رہے تھے۔ دلہا نے کریم کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا جبکہ دلہن سفید رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی۔ دلہن نے اپنے سر پر سفید رنگ کے تازہ پھولوں کا تاج پہن رکھا تھا۔ میں لابی میں کھڑا دلہا دلہن اور اُن کے باراتیوں کو دیکھتا رہا۔ جب دلہا دلہن اور اُن کے باراتی ہال میں داخل ہو گئے تو میں بھی لفٹ میں بیٹھ کر نویں منزل پر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اِس طرح مصر میں میرا دوسرا دن تمام ہوا۔ اُس رات شادی ہال میں رات دیر تک میوزک بجتا رہا۔ میوزک اتنا تیز تھا کہ نویں منزل پر اُس کی بیٹ سنائی دیتی رہی۔ ساتھ ناچنے والوں کی صدائیں بلند ہوتی

رہیں۔ میں نے بارہا چاہا کہ جا کر پارٹی میں شامل ہو جاؤں لیکن پرائی شادی میں شامل ہونا بعض اوقات خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے چپکے سے اپنے بستر میں لیٹا موسیقی کی دھنوں سے لطف اندوز ہو تا رہا۔ پھر نہ جانے کب نیند آگئی۔

مصر میں تیسرا دن

تیسرے دن صبح سو کر اُٹھا تو مطلع کچھ ابر آلود تھا۔ قاہرہ میں بہت کم بارشیں ہوتی ہیں۔ اِس لئے یہ خطرہ تو نہیں تھا کہ بارش ہو گی۔ لیکن آسمان پر بکھرے بادلوں کا اپنا ایک جادو ہوتا ہے۔ انسان کا جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ بادلوں کی طرح فضا میں اُڑنے لگے۔ تمام بندھنوں سے آزاد۔ میں نے حسبِ معمول نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ ہوٹل کی میز نین میں بنے ریستوران میں جا کر فری ناشتہ کیا اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ قاہرہ میں میرے لئے اور زیادہ کچھ نہیں تھا۔ سوچا کیوں نہ آج اسکندریہ چلا جائے۔

اسکندریہ قاہرہ سے مغرب میں کوئی پانچ سو کلو میٹر کے فاصلے پر بحرِ رُوم کے ساحل پر واقع ایک خوبصورت شہر ہے۔

اسکندریہ جانے کا سوچ کر میں نے ہوٹل کے باہر ایک سفید اور کالی ٹیکسی والے کو روکا۔ ٹیکسی والا کوئی پچیس چھبیس سال کا نوجوان دکھائی پڑتا تھا۔

اُسے انگریزی میں پوچھا اسکندریہ چلو گے۔ اُس نے عربی میں جواب دیا صرف عربی میں بات کرو۔ ٹوٹی پھوٹی عربی میں سوال دہرایا تو وہ اسکندریہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں اُس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی اسکندریہ کی طرف چل پڑی۔ اُس سے نام پوچھا تو اُس نے اپنا نام اَحب بتایا۔

ابھی تک جتنے ڈرائیور ملے تھے کسی کا نام محمود تھا کسی کا ابراہیم کسی کا عبدالغنی۔ یہ پہلا ڈرائیور تھا جس کا نام اَحب بروزن عجب تھا۔

میں نے سوچا چلو ہمارے ہاں بھی عجب خان ہوتے ہیں۔ آج عجب خان نہ سہی اَحب ہی سہی۔
اَحب نے ہوٹل سے چلتے ہی پہلے گاڑی رِنگ روڈ پر ڈالی اور پھر قاہرہ سے مغرب کی طرف واقع اسکندریہ کی طرف جانے والی فری وے پر چل پڑا۔
جیسا کہ اسکندریہ نام سے ظاہر ہے یہ شہر سکندرِ اعظم نے ۳۳۲ قبل مسیح میں آباد کیا تھا۔ اِس شہر کو آباد کرنے کے پیچھے جغرافیائی، تجارتی، سیاسی، ثقافتی اور عسکری وجوہات تھیں۔
اسکندر چاہتا تھا کہ مصر میں ایک طاقت ور یونانی مرکز قائم کرے۔ اسکندریہ سے پہلے یہاں مچھیروں کے چند چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ مچھیروں کی اُن بستیوں کو ختم کرکے اسکندر اعظم نے اسکندریہ کی بنیاد رکھی۔ کہتے ہیں اسکندریہ کی بنیاد رکھنے کے بعد اسکندر یہاں سے چلا گیا اور اُس کو اپنی زندگی میں کبھی اسکندریہ لوٹنے کا موقع نہ ملا۔ تاہم تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ کئی صدیوں بعد اسکندر کے مردہ جسم کو لاکر یہاں دفن کیا گیا۔ لیکن آج تک یہ معمہ حل طلب ہے کہ اسکندر کا مزار کہاں ہے۔ یہاں تک کہ یونانی بھی نہیں جانتے کہ اُن کے عظیم بیٹے جس کو دنیا اسکندر اعظم کے نام سے جانتی ہے اس کا مزار کہاں واقع ہے۔
اسکندریہ کی بنیاد رکھنے کے بعد اسکندر تو اسکندریہ سے چلا گیا لیکن کہتے ہیں ایک صدی کے اندر اندر اسکندریہ ایک بہت بڑے شہر میں تبدیل ہو گیا۔
کہتے ہیں کہ بعد میں رومن فاتح جولیس سیزر کی مصر کی ملکہ قلوپطرہ سے ملاقات اسکندریہ میں ہی ہوئی تھی۔ یہیں اُن کی محبت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہیں اُن دونوں کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد جولیس سیزر اور قلوپطرہ روم چلے گئے جہاں قلوپطرہ نے جولیس سیزر کے بیٹے سیزران کو جنم دیا۔ کہتے ہیں کہ روم لوٹنے کے ایک سال کے اندر جولیس سیزر کو قتل کر دیا گیا۔

بہر حال میں اَحب کی معیت میں تیزی کے ساتھ اسکندر یہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس نے گاڑی قاہرہ کی رنگ روڈ سے نکال کر اسکندریہ جانے والی فری وے پر ڈال دی تھی۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کئی جگہ ذکر کیا ہے مصر دیکھنے میں پاکستان کی طرح ہی دکھائی پڑتا ہے۔ پاکستان کی فری ویز پاکستان کا بہتر نقشہ پیش کرتی ہیں۔ پاکستان میں فری وے پر سفر کرتے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ تیسری دنیا کے ایک ملک میں سفر کر رہے ہیں۔ پاکستان کے فری وے کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے فری وے سے کسی لحاظ سے کمتر نہیں۔ پاکستان میں فری وے کی حد توڑ کر کوئی چھابڑی فروش فری وے کے اندر خرید و فروخت کے لئے چھابڑی نہیں لگا سکتا۔ لیکن مصر میں فری وے پر مجھے کوئی ایسی پابندی دکھائی نہ دی۔ کیونکہ فری وے پر جگہ جگہ چھابڑی فروشوں نے اپنے اڈے قائم کر رکھے تھے۔ کئی جگہوں پر فری وے پر لوگ ہاتھ اُٹھائے لفٹ مانگتے بھی دکھائی پڑے۔ ایسے سین دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اہلِ مشرق مغرب کی دیکھا دیکھی یا اُن کے تجارتی پریشر یا نقالی میں ایسی مغرب نما چیزیں بنا لیتے ہیں لیکن اُن کے ساتھ مغربی معیار قائم رکھنا اُنہیں آتے آتے آتا ہے۔

ایسے ہی چند سین دیکھ کر میں نے اَحب کو اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا کہ یہاں ہر چیز پاکستان کی طرح ہے۔ جس کا جواب اُس نے یہ دیا کہ نہیں مصر پاکستان سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔

اسکندریہ کا قاہرہ سے فاصلہ کوئی پانچ سو کلو میٹر کی قریب ہے۔ بلکہ پانچ سو کلو میٹر سے کچھ اوپر ہی ہو گا۔ لیکن جس رفتار سے اَحب گاڑی چلا رہا تھا ہم تین گھنٹے میں اسکندریہ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ راستے میں بہت کم دیہات دکھائی دیئے۔ کہیں کہیں کھیت اور کھجوروں کے باغات دکھائی پڑے۔ کھجوروں کا موسم دور ہونے کی وجہ سے ابھی کھجوروں کے پودوں میں پھل نہیں آیا تھا۔

اسکندریہ کی حدود میں داخل ہوئے تو شہر کے آغاز میں فری وے کے ساتھ ساتھ پانی کے بڑے بڑے قدرتی ذخیرے تھے جن کے بارے میں اَحب نے بتایا کہ وہ فش فارمز ہیں۔ اتنے بڑے فش فارمز دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اسکندریہ کے رہنے والوں کی خوراک میں فش عام استعمال ہوتی ہوگی۔

اسکندریہ ہر اعتبار سے ایک جدید شہر ہے۔ اسکندر نے جب اِس کی بنیاد رکھی ہوگی تو شاید سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اُس کا قائم کردہ شہر ایک دن اتنے خوبصورت اور اتنے بڑے شہر کی صورت اختیار کرلے گا۔

جب ہم اسکندریہ کے مین حصے میں بحرروم کے ساحل کے ساتھ ساتھ بنی شاہراہ پر پہنچے تو اَحب نے ازراہِ تمسخر میرا جملہ سوالیہ انداز میں دہرایا کہ کیا یہ پاکستان کی طرح ہے؟

میں نے بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ نہیں اسکندریہ پاکستان کے شہروں سے زیادہ خوبصورت ہے۔

اسکندریہ پہنچنے تک دن کا ڈیڑھ بج گیا تھا۔ بھوک خوب چمک اُٹھی تھی۔ اِس لئے میں نے اَحب سے کہا کہ وہ کہیں گاڑی روکے تو ہم لنچ کریں۔ اَحب نے اِسی شاہراہ پر ایک طرف بنی پارکنگ کی جگہ پر گاڑی روکی۔ پارکنگ کے بالکل سامنے ایک ریستورانٹ تھا جس کا نام رائل کوزین تھا۔ ہم رائل کوزین کے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو مصری دستور کے مطابق کچھ لوگ لنچ کرکے شیشہ پی رہے تھے اور گپ شپ کر رہے تھے جبکہ کچھ ابھی تک لنچ کرنے میں مصروف تھے۔ لنچ کرنے اور شیشہ پینے والوں میں مصری اور غیر مصری ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ کئی ایک یورپی سیاح دکھائی دیتے تھے۔

میں اور اَحب بھی ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان مصری نے ہمارا آرڈر لیا۔ میں اور اَحب نے چکن سینڈوچ آرڈر کئے۔ میں نے پینے کے لئے پانی جب کہ اَحب نے پیپسی لی۔

مختلف ریستورانوں میں کھانا کھاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ مصری میزبانی میں زیادہ فیاض نہیں ہیں۔ کسی ریستورانٹ میں مہمانوں یا گاہکوں کے سامنے پینے کے لئے فری پانی یا کھانے سے پہلے مہمان کے لئے کھانے کے لوازمات کے طور پر کوئی چیز نہیں رکھی جاتی۔ ہر چیز کے لئے آپ کو قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ گویا مصری بھی امریکہ والے فارمولے کہ امریکہ میں فری لنچ نہیں ملتا پر خوب دل جمعی سے عمل کرتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی اپنے گاہکوں کو کوئی چیز فری پیش نہیں کرتے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام مصریوں کا رویہ انسانی کی بجائے کمرشل زیادہ ہے۔یعنی وہ ہر چیز کو کمرشل حوالے سے زیادہ دیکھتے ہیں۔اِس کی وجہ شاید مصر میں دنیا بھر سے سیاحوں کی آمد ہو۔

لنچ سے فارغ ہو کر ہم سڑک کراس کر کے سمندر کی طرف آ گئے۔ سڑک کراس کرنے کے لئے مصر میں کوئی اصول نہیں۔ سڑک پر کہیں زیبرا کراسنگ کی لائینیں دکھائی نہیں دیتیں۔ سڑک کراس کرتے ہوئے ڈرائیوروں اور سڑک کراس کرنے والوں کے صبر اور حوصلے کا امتحان ہوتا ہے۔ سڑک کراس کرنے والے چلتی ٹریفک کے دوران سڑک پر چل پڑتے ہیں اور چلتی رکتی گاڑیوں کے بیچوں بیچ سڑک کراس کر جاتے ہیں۔ کوئی ڈرائیور کسی سڑک کراس کرنے والے کے لئے تواضع کا اظہار نہیں کرتا۔ دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے کے مصداق ڈرائیور اور سڑک پار کرنے والے اپنا اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔

ہم نے سڑک پار کر کے بحر روم کی چند تصویریں بنائی۔ ساحل پر ہی تھوڑا آگے ایک چھوٹا سا قلعہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اَحب سے پوچھا کہ وہ قلعہ کس کا ہے ؟ اُس نے کہا اُسے صحیح طور پر معلوم نہیں۔ اُس نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ قلعہ کس کا ہے۔ میں نے کہا چلو وہاں چلتے ہیں۔ وہاں جائیں گے تو پتہ چل جائے گا کہ وہ قلعہ کس کا ہے۔

مجھے قلعے میں دلچسپی اُس کی تاریخی وضع قطع دیکھ کر ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زمانہ حال یا ماضی قریب نہیں بلکہ ماضی بعید کی کوئی عمارت ہے۔

ہم دونوں ساحل کے ساتھ بنے فٹ پاتھ پر چلتے قلعہ کے دروازے پر پہنچے تو پتہ چلا کہ یہ مملوک سلطان اشرف السیاف نے ۱۴۸۰ میں ترکوں پر نظر رکھنے کے لئے تعمیر کرایا تھا۔

قلعہ کا ڈیزائن اور تعمیر محیر العقول ہے۔ اس کے تین فلور ہیں۔ دوسرے فلور پر چاروں طرف اندر کی جانب محرابی شکل کے در بنے ہیں جو بیرونی دیوار میں ایک چھوٹے سے چوکھٹے پر منتج ہوتے ہیں۔ اِن دروں سے ہر وقت تازہ ہوا سارے قلعہ میں آتی رہتی ہے۔ اِن دروں کو حملہ آوروں پر اٹیک کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قلعہ کی سیر سے فارغ ہوئے تو شام کے چار بج رہے تھے۔ اسکندریہ میں دیکھنے کے لئے بہت سامان ہے لیکن میں صرف اسکندریہ دیکھنے کی خواہش میں یہاں چلا آیا تھا اس لئے باقی جگہوں پر جانا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی میں چاہتا تھا کہ سر شام قاہرہ واپس پہنچ جاؤں اِس لئے اَحب سے کہا کہ اب جتنی جلدی ممکن ہو واپس کوچ کیا جائے۔

اسکندریہ آنے والے سیاحوں میں سے جن کو تاریخ سے دل چسپی ہو وہ زیادہ تر رومنوں کے زمانے کی تعمیرات کے بچے کھچے نشانات دیکھنے آتے ہیں۔ جنہیں بیچوں سے دل چسپی ہو وہ بحر روم کے اسکندریہ کے ساتھ ساتھ پھیلے ساحلوں پر اپنا وقت گزارتے ہیں۔ یہاں طلوعِ اور

غروب آفتاب کا منظر انتہائی خوبصورت ہوتا ہے۔ اسکندریہ کے باسیوں کو بھی یہ منظر اس قدر بھاتا ہے کہ وہ اکثر اکیلے یا اپنی فیملیوں کے ساتھ محض طلوع یا غروب آفتاب کے مناظر دیکھنے کے لئے سمندر کنارے چلے آتے ہیں۔

اسکندریہ میں بحر روم کے کنارے بنے قطیبہ کے قلعے میں داخل

ہونے کا دروازہ

اسکندریہ کی ایک اسٹریٹ کا منظر

اسکندریہ کے ساحل پر بحر روم کا ایک منظر

اسکندریہ یونیورسٹی کا بیرونی منظر

اسکندریہ شاید مصر کا واحد شہر ہے جہاں لوگ چوبیس گھنٹے سڑکوں پر گھومتے پھرتے اور آوارگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

خیر ہم واپسی کا فیصلہ کر کے واپس چلتے اپنی گاڑی کے پاس آئے اور گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کی راہ لی۔ تھوڑا ہی چلے ہوں گے کہ ایک انتہائی جدید اور خوبصورت عمارت دکھائی دی جہاں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا بہت رش تھا۔ میں نے اَحب سے پوچھا کہ یہ کونسی جگہ ہے۔ کہنے لگا یہ شرق اوسط کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ ہم وہاں سڑک پر تھوڑی دیر گاڑی کھڑی کر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ہجوم میں چلے۔ سب ایک دوسرے سے بے نیاز گپ شپ اور کھیل کود میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ وہاں اپنے بچوں کو گھمانے بھی لائے ہوئے تھے۔ زیادہ تر لڑکے پینٹوں شرٹوں میں ملبوس تھے۔ لڑکیوں کا بھی یہی عالم تھا۔ زیادہ تر لڑکیاں پینٹوں میں ملبوس تھیں مگر سر پر اور گردنوں کے ارد گرد اسکارف لپیٹ رکھے تھے۔ میں نے احب سے پوچھا کہ دوسرے عرب ملکوں میں مسلمان کئی کئی شادیاں کرتے ہیں یہاں مصر میں کیا حال ہے۔

اس نے کہا یہاں بھی چار شادیاں کرنا ممکن ہے مگر رجحان کم ہے۔ عام طور پر لوگ ایک ہی شادی کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر یونیورسٹی میں گھومنے کے بعد ہم واپس اپنی گاڑی کی طرف آئے تو مجھے عمر خیام نام کا ایک کیفے دکھائی دیا۔ کسی نے عمر خیام کو ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لئے اُس کے نام کا کیفے بنا دیا تھا۔ عمر خیاں کیفے کے ساتھ ہی ایک ہوٹل تھا جس کا نام تھا فندق رعمسیس۔ فندق عربی میں ہوٹل کو کہتے ہیں ااور رعمسیس آپ جانتے ہی ہیں فراعنہ مصر میں سے ایک کا نام تھا۔ جس کا تفصیلی ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔

ہم واپسی کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ دنیا کے دیگر شہروں کی طرح اسکندریہ میں بھی شام کارش شروع ہو گیا تھا۔ اَحب نے گاڑی چلانا شروع کی تو کھڑکی سے ہاتھ ہلا کر اسکندریہ کو بائی بائی کہا۔ اگلے دس پندرہ منٹ شہر کی ٹریفک میں گاڑی چلانے کے بعد ہم قاہرہ کی طرف جانے والی فری وے پر تھے اور اَحب جلد سے جلد قاہرہ پہنچنے کے لئے مقررہ حد رفتار سے تیز گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے اسپیڈ میٹر سے مسلسل اُوور اسپیڈنگ کی بیپ سنائی دے رہی تھی جبکہ میں گاڑی کی پشت پر سر رکھے سو رہا تھا۔ ہم قاہرہ پہنچے تو شہر رات کی روشنیوں سے منور ہمارے لئے چشم براہ تھا۔ مجھے روشنیوں میں نہائے قاہرہ کو دیکھ کر قاہرہ والوں پر رشک آیا۔ کبھی پاکستان کے شہر بھی ایسے ہی راتوں کو منور ہوتے تھے۔ میں جب سے قاہرہ آیا تھا میں نے ابھی تک ایک لمحے کے لئے لوڈ شیڈنگ نہیں دیکھی تھی۔ میں نے شہر کی روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے اَحب سے پوچھا کیا یہاں کبھی بجلی جاتی ہے۔ اُس نے میرے سوال پر تعجب کا اظہار کیا اور پھر ہنستے ہوئے کہا۔ نہیں کبھی نہیں۔

مصر میں چوتھا دن

رات میں اور اَحب اسکندریہ سے لوٹے تو اَحب نے پوچھا کہ میں کل کہاں جانا پسند کروں گا۔ میں نے کہا کل ہم نہر سویز دیکھنے جائیں گے اور سویز کے ساتھ ہی صحرائے سینا ہے وہاں جائیں گے۔

مجھے سمندر اور صحرا ہمیشہ پسند رہے ہیں۔ سمندر اور صحرا میں ایک عجیب تعلق ہے۔ کیا تعلق ہے اگر بیان کرنا چاہوں تو شاید نہ کر پاؤں۔ لیکن میں صرف یہ جانتا ہوں کہ دونوں مجھ پر سحر طاری کر دیتے ہیں۔

میں اپنے خوابوں میں اکثر سمندروں اور صحراوں میں سرگرداں رہتا ہوں۔ دونوں کی وسعت اور پھیلاؤ مجھے مبہوت کر دیتا ہے۔

میں نے اَحب استفسار پر اُس کو صبح دس بجے آنے کا وقت دیا۔ لیکن رات اچانک میری طبعیت خراب ہو گئی۔

ہلکی ہلکی خرابی تو خیر شینن میں غیر متوقع لینڈنگ کے وقت شروع ہو گئی تھی لیکن دوا کے استعمال سے طبعیت قدرے کنٹرول میں رہی تاہم گزشتہ روز ایک ہزار کلو میٹر کے سفر نے مجھے کچھ زیادہ ہی تھکا دیا۔ فلو کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اِس کیفیت کے ساتھ رات میں نے بھرپور کوشش کی کہ مکمل آرام کروں لیکن کہتے ہیں ناں کہ عشق کے ماروں کو چین کہاں آرام کہاں۔ ہوٹل کے آرام دہ ترین بستر کے باوجود نیند مجھ سے مسلسل دامن چھڑاتی رہی۔ رات کے پچھلے

پہر اسپرین، جو کہ میں اپنے ساتھ یو ایس اے سے حفظِ ماتقدم کے طور پر لایا تھا، کی دو گولیاں لیں تو تب جا کر کہیں رات کے پچھلے پہر نیند کی دیوی مہربان ہوئی۔

بستر میں صبح کے نو بج گئے۔ تھکن اور نقاہت کی وجہ سے بستر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن پھر اَحب سے سویز اور سینا جانے کا وعدہ کچوکے لگا تا رہا۔ وہ گیزا میں رہتا تھا۔ میرے پاس اُس کا فون نمبر نہیں تھا ورنہ کال کر دیتا کہ نہ آئے۔

نہر سویز پورٹ توفیق کے مقام پر

پورٹ توفیق جہاں نہر سویز بحر احمر کے ساتھ ملتی ہے

آخر خدا خدا کر کے ہمت باندھی۔ نہا دھو کر تیار ہو کر نیچے ہوٹل کی طرف سے ملنے والا فری ناشتہ کیا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

اَحب پہلے سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ چند رسمی کلمات کے بعد گاڑی میں بیٹھا اور ہم سویز کی طرف عازمِ سفر ہوئے۔

سویز قاہرہ سے مشرق کی سمت کوئی ایک سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ سویز سے پندرہ کلو میٹر پہلے ایک سڑک سینا کی طرف چلی جاتی ہے جب کہ مین روڈ سویز کی طرف نکل جاتی ہے۔

ہمارا ارادہ پہلے سویز جانے کا تھا اِس لئے ہم مین روڈ پر چلتے چلے گئے۔ کوئی دس پندرہ منٹ بعد گاڑی سویز کی حدود میں داخل ہو گئی ہے۔ وہاں کئی چھوٹے چھوٹے شہر آباد ہیں۔

یہیں پر پورٹ توفیق بھی ہے۔ پورٹ توفیق دراصل وہ جگہ ہے جہاں نہر سویز بحر احمر سے ملتی ہے۔

نہر سویز کا آغاز بحر روم پر واقع پورٹ سعید سے ہوتا ہے۔ سویز کی ہسٹری سے پتہ چلتا ہے کہ اِس کی پہلی کھدائی رعمسیس دوم کے دور میں ہوئی۔ اِس کے بعد تقریباً ہر دور میں اِس علاقے میں متحرک قوتیں اِس نہر میں دل چسپی لیتی رہیں۔ یونانی تاریخ دان ہیروڈوٹس نے اِس نہر کا ذکر کرتے ہوئے اِس کی چوڑائی کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک وقت میں چار کشتیاں اپنے پتوار کھول کر متخالف سمت میں سفر کر سکتی ہیں۔

عہد جدید میں اس ۱۹۴ کلو میٹر نہر کی کھدائی کا آغاز ۱۸۵۹ میں ہوا۔ دس سال تک تعمیر کے بعد اسے بحر روم اور بحر احمر کے درمیان بین الاقوامی سفر کے لئے ۱۹۶۹ میں کھول دیا گیا۔

نہر سویز کی وجہ سے بحری جہازوں کے لئے براعظم افریقا کے گرد چکر لگانے کی بجائے صرف ۱۹۴ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے بحر روم سے بحر احمر اور بحر احمر سے بحیرہ عرب اور بحیرہ عرب سے بحر ہند میں داخلہ ممکن ہوا۔

ہم گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں سو سوا سو کلو میٹر کا سفر کر کے سویز پہنچے تو شہر میں جمعہ کی نماز پڑھی جا رہی تھی۔

پاکستان کے مولویوں کی طرح مصر کے مولوی بھی اسپیکروں پر دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔ مزے دار بات یہ ہے کہ قاہرہ میں شاید گورنمنٹ نے اذان اور تقریروں کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اس لئے قاہرہ میں اذان کے وقت یا جمعہ کے وقت اسپیکر پر کوئی شور سنائی نہیں دیتا۔ لیکن باقی شہروں میں ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اِسی وجہ سے سویز میں مولویوں کی دھواں دھار تقریریں جاری تھیں۔

شہر میں ایک جگہ فوجی چوکی تھی وہاں ڈیوٹی پر موجود چالیس پچاس فوجی وردی سمیت باجماعت نماز ادا کر رہے تھے۔ ایک فوجی گن پکڑے اُن کی حفاظت کر رہا تھا۔

اُنہیں اِس طرح نماز ادا کرتے دیکھ کر مجھے اقبال کا شعر۔۔۔ الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ہے ملاں کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور۔۔۔۔ یاد آیا۔ میں نے بلند آواز میں شعر پڑھا۔ اَحب نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں اِس شعر کا ترجمہ کیا۔ لیکن اُس کے خاک پلے نہ پڑا۔ تاہم یہ حیران کن بات تھی کہ وہ اقبال کے نام سے واقف تھا۔ اُس نے اقبال کا نام سُن کر اُم کلثوم کے گائے ہوئے اقبال کے کلام کے ترجمہ کا حوالہ دیا۔ پھر کہنے لگا شاعر عموماً پاگل ہوتے ہیں۔ ایک خیالی دنیا میں رہتے ہیں جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

میں نے کہا تم گیت اتنے شوق سے سنتے ہو یہ بھی تو شاعر ہی لکھتے ہیں۔ کہنے لگا گیتوں کی بات اور ہے۔ اُن کے ساتھ موسیقی ہوتی ہے۔

سویز ٹاون میں بحر احمر کے قریب پہنچ کر سڑک بائیں جانب مڑھ گئی۔ بائیں جانب مڑ کر ہم بمشکل دو میل گئے ہوں گے کہ دائیں ہاتھ ہمیں پورٹ توفیق دکھائی دی۔ یہاں نہر سویز بحر احمر میں ضم ہو رہی تھی۔ ہم تھوڑی دیر وہاں رُکے۔ ایک چائے والے سے چائے خرید کر پی۔ چند تصویریں بنائیں اور واپسی کی راہ لی۔ سویز سے واپس چلے تو تھوڑی دور سینا جانے والی سڑک دکھائی دی۔ ہم نے مین سڑک سے گاڑی سینا جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ ویسے تو یہ سارا علاقہ صحرائے سینا ہی تھا۔ سویز سے نکلتے ہی صحرائے سینا شروع ہو جاتا ہے جو قاہرہ کے مشرق میں تاحد نظر پھیلا ہے۔ دس پندرہ منٹ گاڑی چلانے کے بعد صحرا میں سڑک سے دور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ انہی پہاڑیوں میں سے ایک جبلِ موسیٰ بھی ہے۔ جبل موسیٰ ارد گرد کی پہاڑیوں سے زیادہ بلند ہے۔ جہاں تینوں مذاہب کے ماننے والے زیارت کے لئے آتے رہتے ہیں۔

صحرائے سینا کا ایک منظر

صحرائے سینا کا ایک اور منظر

صحرائے سینا میں جبلِ موسیٰ کا ایک منظر

صحرائے سیناخاصہ طویل و عریض صحرا ہے۔ یہ وہی صحرا ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ماننے والے یہودیوں کے ساتھ سر گرداں رہے۔ اسی صحرا میں اُن پر من و سلویٰ اُترا۔ کہتے ہیں من و سلویٰ رات کے وقت صحرا میں شبنم کی بوندوں کی طرح، جو دیکھنے میں دھنیے کے بیجوں کی طرح دکھائی دیتا تھا، آسمان سے گرتا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ یہودی دن کے وقت اُسے اکٹھا کر کے پیس کر اس سے آٹا بنا کر اس کی روٹیاں بناتے اور کھاتے۔ یہودیوں کی کچھ کتابوں میں لکھا ہے کہ من و سلویٰ کا ذائقہ زیتون کی طرح تھا۔ کچھ کتابوں میں لکھا ہے کہ اُس کا ذائقہ شہد کی طرح تھا۔

یہیں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لاٹھی مارنے سے پتھر سے بارہ چشمے بہہ نکلے تھے۔ یہودیوں کے بارہ قبیلوں میں سے ہر قبیلے کے لئے ایک چشمہ تھا۔ لیکن اب صحرائے سینا میں کسی جگہ ایسے کسی چشمے کے کوئی نشان نہیں۔

یہیں جبلِ موسیٰ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جلتی ہوئی جھاڑی کی اوٹ میں خدا دکھائی دیا، خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی اور اُن کی امت کے لئے خدا کی طرف سے اُن کو احکام کی تختیاں عطا کی گئیں۔ اِن احکام کو عرف عام میں ٹین کمانڈ مینٹس یعنی دس احکام کہا جاتا ہے۔ ان دس احکام میں سے پہلا حکم مسلمانوں کے کلمہ ءاول کا پہلا حصہ لاَ اِلہٰ اِلا اللہ یعنی خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

اب جبلِ موسیٰ پر عین اِس جھاڑی کے مقام پر ایک چرچ بنا دیا گیا ہے۔ پہاڑی پر بنے چرچ تک جانے کے لئے پتھروں سے سیڑھیاں بنا دی گئی ہیں۔ تقریباً چار ہزار سیڑھیاں ہیں جن پر چڑھنے کے لئے جوانی کے ساتھ دل اور گردہ چاہئے۔ پہاڑی پر واقع چرچ تک جانے کے لئے

تقریباً ساڑھے تین چار گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔ مزے دار بات ہے کہ غارِ حرا تک جانے کے لئے بھی تین چار گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ جبل موسیٰ پر مقام مقدس تک جانے کے لئے سیڑھیاں بنائی گئی ہیں جبکہ غار حرا تک جانے کے لئے زائر کو پہاڑی پر چڑھنا پڑتا ہے۔

چناچہ ہم پہاڑ کی چند تصویریں بنا کر دوبارہ صحرائے سینا میں گاڑی چلاتے واپس قاہرہ لوٹ آئے۔ قاہرہ پہنچے تو شام کے چار ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اَحب نے مجھ سے اگلے دن کا پروگرام پوچھا لیکن میں نے شکراًیا اخی کہہ کر کل کے لئے معذرت کر لی۔ دراصل اگلے دن میں مکمل آرام کرنا چاہتا تھا اور اپنے نوٹس کو دیکھ کر اِس سفر نامے کو تحریری شکل دینا چاہتا تھا۔ ذہن میں چیزیں تازہ ہوں تو اُنہیں احاطہ تحریر میں لانا آسان ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یادداشت چیزوں کو گڈمڈ کرنا شروع کر دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں بعض اوقات چیزیں آگے پیچھے ہو جاتی ہیں۔

میرے انکار سے اَحب کو کچھ مایوسی ہوئی لیکن میں نے اُسے ایک بڑی ٹپ دے کر خوش کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اتوار کی صبح جب میں نیویارک جاؤں تو جہاز کے طویل سفر کے لئے میرا انرجی لیول ٹھیک ہو۔

ویسے بھی اب قاہرہ میں میرے لئے کچھ اور نہیں تھا۔ مغربی ممالک سے سیاح ان ممالک میں آتے ہیں تو وہ سوینیرز خریدتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ جن کا تعلق دنیا کے اسی خطے کے ساتھ ہے مغربی سیاحوں کے سوینیرز ہمارے لئے روز مرّہ کے استعمال کی چیزیں ہیں۔ شرم الشیخ، پورٹ سعید، لکسر اور اسوان ڈیم قاہرہ سے کافی دور واقع ہیں۔ مصر کے یہ سب شہر اور مقامات قابلِ دید ہیں۔ لیکن ایک دن میں وہاں جانا اور وہاں سے قاہرہ واپس لوٹنا ممکن نہیں۔ اِس لئے عافیت اِسی میں سمجھی کہ اِن علاقوں کی سیاحت کو مصر کے آئندہ سفر کے لئے بچا کر رکھا جائے۔

امریکہ واپسی

پروگرام کے مطابق میں نے اگلا دن سفیر ہوٹل میں اپنے کمرے میں گزارا۔ شروع سے لیکر گزشتہ دن کے تمام احوال قلمبند کئے۔

اگلے دن صبح ساڑھے نو بجے ایجپٹ ائیر لائن سے نیویارک واپسی تھی۔ ہوٹل سے ائیرپورٹ تقریباً پندرہ سے بیس منٹ کا راستہ تھا۔ لیکن پھر بھی دوڈھائی گھنٹے پہلے ائیرپورٹ پہنچنا ضروری تھا۔

چناچہ اگلے دن صبح ہی صبح اُٹھ کر اپنا سامان پیک کیا۔ چھ بجے ہوٹل کا ریستوران ناشتے کے لئے کھل چکا تھا۔ اِس لئے جلدی سے تیار ہو کر نیچے آیا۔ ریستوران میں آخری بار فری ناشتہ کیا۔ لابی میں جا کر چیک آؤٹ کیا۔ اور ٹیکسی لے کر ائیرپورٹ روانہ ہو گیا۔ ائیرپورٹ پر کسی اسٹیشن پر کسی ائیر لائن کا سائن نہیں تھا۔

بس مسافروں کی ایک طویل قطار تھی جو چیک اِن کاؤنٹرز پر جا کر منتج ہوتی تھی۔ میں بھی اُس قطار میں کھڑا ہو گیا۔ چیک اِن کاؤنٹرز پر کافی کلرک تھے اِس لئے قطار خاصی تیزی سے چل رہی تھی۔ جب کلرک کے پاس پہنچا تو پتہ چلا کہ میں غلط قطار میں کھڑا ہوں۔ کلرک نے مجھے بتایا کہ نیویارک جانے کے لئے مجھے ۴۳ نمبر کے چیک ان کاؤنٹر پر جانا ہے۔ اُس چیک اِن کاونٹر پر بھی کوئی سائین نہیں تھا۔ صرف ایجپٹ ائیر لائن لکھا تھا۔ نہ کوئی فلائٹ نمبر تھا۔ نہ کسی شہر کا نام لکھا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے وہاں کوئی لائن نہیں تھی۔ اس لئے چیک اِن کلرک نے فوراً ہی میرا پاسپورٹ لے کر مجھے امیگریشن فارم اور بورڈنگ پاس تھمادیا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے امیگریشن فارم بھرا اور پرواز کے لئے متعلقہ گیٹ کی طرف چل پڑا۔ گیٹ پر پہنچا تو

سارے مسافر گیٹ کی لابی میں جمع تھے۔ گیٹ ابھی بند تھا۔ پرواز سے ایک گھنٹہ قبل گیٹ کھلا تو مسافروں کو ایک بار پھر مکمل سکیورٹی سے گزار کر جہاز کے اندر لے جایا گیا۔ دیکھنے میں یہ جہاز بھی ویسا ہی تھا جس کا آتی بار انجن فیل ہوا تھا۔ تاہم ٹیکنالوجی پر اعتماد نے دل میں خدشات کو جنم لینے نہ دیا اور میں اپنی سیٹ پر دبک کر بیٹھ گیا۔

میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک نوعمر لڑکی بیٹھی تھی جو دیکھنے میں فلپینو دکھائی پڑتی تھی لیکن اُس کے اطوار مصری تھے۔ گفتگو بھی عربی میں کرتی تھی۔ مجھے لگا شاید کمال کی طرح کسی مصری نے کسی فلپینو خاتون سے شادی کی ہو گی جس میں سے یہ بچی پیدا ہوئی ہو گی۔

سیٹ پر بیٹھتے ہی اُس نے ایئر ہوسٹس سے کہا کہ وہ سیٹ تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ وہ کھڑکی کے قریب نہیں بیٹھنا چاہتی۔ ایئر ہوسٹس نے اُسے جہاز اُڑنے تک وہیں بیٹھنے کا مشورہ دیا۔

جہاز اُڑا تو میری ہمسفر نے اپنے سیل فون کے کیمرے سے ٹیک آف کی منظر کشی کی۔ جب کہ میں نے کمپیوٹر کھول کر دوبارہ اپنے سفر نامے پر کام شروع کر دیا۔

امریکہ سے آتے ہوئے شینن میں ہوٹل میں ناشتہ کرتے ہوئے ایک مصری مجھ سے ایجپٹ ایئر لائن کی سروس کے معیار پر گفتگو کر رہا تھا۔ مجھے ایئر لائن کی سروس سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن جس طرح شینن میں ایئر لائن نے کرائسس کو ہینڈل کیا تھا اُس سے مجھے سخت شکایت تھی۔ میں نے کئی ایک چیزوں کی نشاندہی کی جن سے شینن میں ایئر لائن گریز کر کے مسافروں کے لئے آسانی پیدا کر سکتی تھی۔ لیکن وہ مصری ہونے کی وجہ سے اپنے ملک کی ایئر لائن کے لئے مدافعانہ گفتگو کر رہا تھا۔

جہاز دس گھنٹے کی پرواز کے بعد نیویارک میں جے ایف کے پر اُترا تو میں جلدی سے اپنا اٹیچی اُٹھا کر امیگریشن کاؤنٹر پر جا پہنچا۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے امیگریشن افسر کو اپنا پاسپورٹ تھمایا تو ساتھ والے کاؤنٹر سے اُسی مصری کی آواز آئی۔

وہ امیگریشن کاونٹر پر کھڑا اونچی آواز میں مجھے کہہ رہا تھا "یہ جہاز اور سفر کیسا تھا؟" میں نے دوسرے کاؤنٹر پر کھڑے باآوازِبلند جواب دیا۔ " اچھا تھا لیکن میں خوش ہوں کہ بسلامت گھر واپس پہنچ گیا ہوں۔"

اُس کا اور میرا امیگریشن افسر ہمارے چہروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نہ اُس کے امیگریشن افسر نے کوئی سوال کیا نہ میرے امیگریشن افسر نے۔ اُنہوں نے اُس کے اور میرے پاسپورٹ پر انٹری اسٹیمپ لگائی اور ہم دونوں اپنے اپنے پاسپورٹ پکڑ کر امیگریشن کاؤنٹر سے کسٹم میں چلے آئے۔

مصری نے مجھ سے پوچھا: "کیسا لگا مصر۔۔۔؟"

میں نے جواب دیا: " بہت اچھا۔ لیکن وقت بہت کم تھا۔ شاید مجھے ایک بار پھر مصر جانا پڑے۔ ابھی بہت سے علاقے دیکھنے کو رہ گئے ہیں۔ جہاں اگلے ٹرپ میں جاؤں گا۔" پھر ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور کسٹم سے ہوتے ہوئے ائیر پورٹ سے باہر نکل گئے۔

ختم شد

کچھ مصنف کے بارے میں

خواجہ اشرف 1951 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1971 میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کے بعد پہلے مختصر عرصہ کے لیے اسلام آباد میں پریذیڈنٹ سیکریٹریٹ میں کام کیا۔ پھر پنجاب پبلک سروس کمشن سے انتخاب کے بعد پنجاب میں محکمہِ تعلیم سے وابستہ ہوئے اور پنجاب کے مختلف کالجوں میں بطورِ لیکچرار پڑھاتے رہے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ دورانِ تعلیم پاکستان کے مختلف اخبارات میں کے ایم اشرف کے نام سے سیاسی، سماجی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھے۔

پاکستان میں وزیر آغا کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین اوراق اور ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین شب خون میں کئی کہانیاں اور انشایئے لکھے۔

جنرل ضیاالحق کے مارشل لاء کے بعد 1981 میں امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں یونیورسٹی آف فینکس سے ایم بی اے کرنے کے بعد کاروباری دنیا سے وابستگی اختیار کی۔

امریکہ منتقلی کے بعد ضیا دور میں مختلف بین الاقوامی فورمز پر پاکستان میں بحالی جمہوریت کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ یہ جدوجہد مشرف دور میں بھی جاری رہی۔ اب بھی پاکستان میں جمہوریت کی نشوونما اور ترویج واشاعت سے خاص دلچسپی ہے۔

ادب میں ترقی پسند رجحانات کی طرف جھکاؤ ہے۔ زیرِ نظر سفر نامے " کنارِ نیل " کے علاوہ ایک اور سفر نامے "اسرائیل میں چند روز" اور تین ناولوں 'مٹی کا بیٹا' ، 'نسل سوختہ' اور 'شب گزیدہ سحر' اور کہانیوں کے تین مجموعوں "آئینہ کہانی" اور "مکالمے کا قتل" اور

"تاریکی میں چلتے لوگ" اور نثری نظموں کی ایک کتاب "برف میں کھلا پھول" کے مصنف ہیں۔ تاحال لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

مصنف کی دیگر کتابیں

مٹی کا بیٹا۔۔۔ناول

ایک اچھوتی اور دلچسپ کہانی جو پاکستان کے چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہو کر امریکہ سے ہوتی ہوئی اُسی گاؤں میں ختم ہوتی ہے۔ کہانی کا ہیرو ساری عمر اپنے طبعی والد کی تلاش میں کئی دلچسپ مرحلوں سے گزرتا ہے۔ انسانی جذبوں کی عظیم داستان جو انسان دوستی اور انسانی مساوات کا درس دیتی ہے۔ تشدد اور جنگ سے بچنے کا سبق سکھاتی ہے۔ زندگی کے احترام کی تلقین کرتی ہے۔

نسلِ سوختہ۔۔ناول

1947 میں پاکستان بننے سے لیکر 1971 میں قائد اعظم محمد علی جناح کے پاکستان ٹوٹنے کی کہانی۔ پاکستانی سیاست کی بائیبل جس میں اُن کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی وجہ سے 1971 میں قائداعظم محمد علی جناح کا پاکستان دولخت ہُوا۔ پاکستان کی مخصوص صورت حال کے پیش نظر پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے ممکنہ حل پیش کرتی ہے۔ پاکستانی سیاست میں دلچسپی رکھنے والے کسی بھی شخص کے لئے اس ناول کا مطالعہ ازحد ضروری ہے۔ اس کا مطالعہ اُنہیں پاکستان کو ایک نئے پس منظر میں دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

شب گزیدہ سحر۔۔ناول

شب گزیدہ سحر روسی انقلاب کے بعد سوویت یونین کی تشکیل سے لے کر تحلیل تک کی کہانی ہے جو ایک رومانی داستان کے ذریعے نہ صرف انقلاب کی کہانی سناتی ہے بلکہ سوویت یونین کے عروج وزوال اور آخرِکار تحلیل کے پس پردہ عوامل اور کرداروں کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ ناول

اپنے قارئین کو سوویت یونین کے بارے میں ایک نیا پسِ منظر پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر انقلابی کارکن اس ناول کو پڑھ کر انقلاب کے لئے اپنی جدوجہد میں ممکنہ غلطیوں سے خود کو اور تحریک کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

آئینہ کہانی۔۔۔کہانیوں کا مجموعہ

آئینہ کہانی میں مصنف کے قلم سے لکھی گئی چھبیس انوکھی اور دلچسپ کہانیاں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر کہانی زندگی کے کسی نہ کسی انوکھے رُخ کی نشاندہی کرتی ہے جسے پڑھ کر انسان بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مکالمے کا قتل۔۔۔کہانیوں کا مجموعہ

مکالمے کا قتل مصنف کے قلم سے لکھی گئی پچیس مزید کہانیوں کا مجموعہ جن میں مصنف نے انوکھے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اِن کہانیوں میں مصنف کا دیگر لکھاریوں سے ہٹ کر چیزوں کو دیکھنے کا عمل اُسے ایک طرف اپنے ہم عصر لکھاریوں سے ممتاز کرتا ہے اور دوسری طرف قارین کو ان موضوعات کو مکمل طور پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالنے کی دعوت دیتا ہے۔ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ زندگی کو ایسے زاویوں سے بھی دیکھا جا سکتا ہے لیکن آج تک وہ ایسا کیوں نہیں کر سکا۔

تاریکی میں چلتے لوگ۔۔۔کہانیوں کا مجموعہ

تاریکی میں چلتے لوگ مصنف کے قلم سے لکھی گئی چھبیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ کہانیوں کے موضوعات ہمارے عہد کے شعوری تضادات کو اتنی خوبصورتی سے اپنے گرفت میں لیتے ہیں کہ قاری انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ کہانیوں کی کنسٹرکشن اتنے فن کارانہ انداز میں کی گئی ہے

کہ مصنف اردو کہانی نگاروں سے سے اُٹھ کر بین الا قوامی کہانی نگاروں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ تاریکی میں چلتے لوگ کی کہانیاں اُسے سعادت حسن منٹو اور ٹیگور کی کہانیوں کی یاد دلاتی ہیں۔

اسرائیل میں چند روز۔۔۔سفر نامہ

اسرائیل میں چند روز میں مصنف نے اسرائیل میں گزارے چند دنوں کی کہانی اتنی خوبصورتی اور مہارت سے بیان کی ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایک پل مصنف کے ساتھ اسرائیل کا سفر کر رہا ہے۔ اس سفر نامہ میں یروشلم سے تعلق رکھنے والے پیغمبروں کے سبھی مقبروں کی کلر تصاویر کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگیوں کے منفرد واقعات شامل ہیں جو آپ کو کسی اور کتاب میں نہیں ملیں گے۔ کتاب میں اسرائیل کے معرض وجود میں آنے سے لے کر آج تک کی صورت حال پر بصیرت افروز معلومات کی تفصیل درج ہے۔

برف میں کھلا پھول۔۔۔نثری نظمیں

برف میں کھلا مصنف کا ۷۵ نثری نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے جنہیں پڑھ کر قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ نثری نظم میں بھی ایسے شاعرانہ امیجز تراشے جاسکتے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان وہی حظ اٹھاتا ہے جو کبھی روایتی شاعری کا طرہ امتیاز تھا۔

کنارِ نیل۔۔۔سفر نامہ

مصنف نے 2012 میں کئے گئے اپنے مصر کے سفر کی داستان اتنی خوبصورتی اور مہارت سے تحریر کی ہے کہ قاری سارے سفر میں مصنف کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اس سفر میں جہاں قاری

مصنف کی آنکھوں سے مصر دیکھتا ہے وہاں مصر کی تاریخ، جغرافیہ اور ثقافتی لینڈ اسکیپ سے بھی مکمل آگاہی حاصل کرتا ہے۔

کتاب خریدنے کے لیے مندرجہ ذیل ای میل پر رابطہ کریں:

Email: kashraf@ix.netcom.com